# اُردو لازمی

برائے جماعت نہم

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

# اُردو (لازمی)

## برائے جماعت نہم

نیو کالج پبلی کیشنز

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

# عزیز طلبہ!

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ طلبہ کے لئے درسی کتب کی تیاری پر مامور ہے۔ بورڈ اس سلسلے میں نامور ماہرین تعلیم کی خدمات سے استفادہ کرتا ہے جو شب و روز کی عرق ریزی کے بعد کتابوں کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اگرچہ کتابوں کے مواد اور معیار کو بہتر بنانے کے لئے ہم مسلسل کوششیں کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی بہتری کی گنجائش برقرار رہتی ہے۔ غلطیوں کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس پس منظر میں طلبہ، اساتذہ کرام اور والدین سے گذارش ہے کہ وہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ ان کتب کے معیار کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

**چیئرمین**

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

فون نمبر: 081-2470503

081-2470501

جملہ حقوق بحق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں

منظور کردہ صوبائی محکمہ تعلیم حکومت بلوچستان کوئٹہ، پاکستان No. SO (Academic)/ EDN:/ 2-6/ 2276 مورخہ 18 جنوری 2013 بمطابق قومی نصاب 2006ء اور نیشنل ٹیکسٹ بک اینڈ لرننگ میٹریل پالیسی 2007ء دفتر ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم اینڈ ایکسٹینشن سینٹر بلوچستان کوئٹہ بحوالہ مراسلہ نمبر C.B /9023 مورخہ 21 جنوری 2013ء اس کتاب کو بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ نے ناشر سے پرنٹ لائسنس حاصل کر کے سرکاری سکولوں میں مفت تقسیم کے لیے بھی طبع کیا ہے۔ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ اور ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی امدادی کتاب یا گائیڈ وغیرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

نصابی کتاب ...... اُردو (لازمی) برائے جماعت نہم

مرتبین ......(۱) پروفیسر حاجی حمید اللہ جلال زئی (ایم۔اے اُردو، یونیورسٹی آف پنجاب)
سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی

(۲) شوکت ترین (ایم۔اے اُردو، ایم۔اے پشتو، ایم۔ایڈ)
ماہر مضمون گورنمنٹ کالج آف ایلیمنٹری ایجوکیشن لورالائی

مدیر ...... پروفیسر ڈاکٹر عرفان احمد بیگ
شعبہ اُردو تعمیر نو پبلک کالج کوئٹہ

### انٹرنل ریویو کمیٹی:

پروفیسر دانیال طریر • شبانہ سلطان • سید نائب جان آغا • بشریٰ تحسین • رستم سودائی

### پراونشل ریویو کمیٹی:

طیب محمود رائے • پروفیسر صابر بولانوی • طلعت یاسمین • غلام محمود اختر • رحمت صنوبر عثمانی • عبدالخالق بغلانی

لے آؤٹ ______ امجد قادری

تیار کردہ: نیو کالج پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) کوئٹہ

پرنٹر: ______ نیو کالج پبلی کیشنز (رجسٹرڈ) کوئٹہ

نگران طباعت: بہاؤالدین کاکڑ (ماہر مضمون)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

# فہرست

## حصہ نثر


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | اسلام میں گداگری کی مذمت | مولانا الطاف حسین حالی | ۲ |
| ۲ | ہجرت نبوی ﷺ | شبلی نعمانی | ۱۳ |
| ۳ | سیر زندگی | محمد حسین آزاد | ۲۰ |
| ۴ | ایثار | ڈپٹی نذیر احمد | ۲۸ |
| ۵ | کراچی کی طوطا کہانی | قدرت اللہ شہاب | ۳۴ |
| ۶ | مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ | سجاد حیدر یلدرم | ۴۸ |
| ۷ | شہید | مرزا ادیب | ۵۷ |
| ۸ | نام دیو مالی | مولوی عبدالحق | ۶۸ |
| ۹ | مردہ بدست زندہ | فرحت اللہ بیگ | ۷۴ |
| ۱۰ | خطوط غالب | مرزا غالب | ۸۳ |


## حصہ نظم


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | حمد | مولانا الطاف حسین حالی | ۹۱ |
| ۲ | نعت | امیر مینائی | ۹۴ |
| ۳ | برسات کی بہاریں | نظیر اکبر آبادی | ۹۷ |
| ۴ | پیوستہ رہ شجر سے | علامہ اقبال | ۱۰۱ |
| ۵ | نمودِ سحر | حفیظ جالندھری | ۱۰۴ |
| ۶ | دنیا | میر انیس | ۱۰۸ |


## حصہ غزل


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | رہی نہ گفتہ میرے دل میں داستاں میری | میر تقی میرؔ | ۱۱۳ |
| ۲ | یہ آرزو تھی تجھے گل کے رُو برو کرتے | خواجہ حیدر علی آتشؔ | ۱۱۷ |
| ۳ | سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں | مرزا غالبؔ | ۱۲۱ |
| ۴ | جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے | بہادر شاہ ظفرؔ | ۱۲۵ |
| | فرہنگ | | ۱۲۷ |

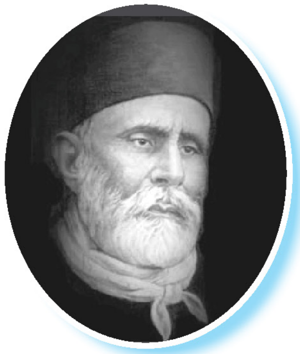

# الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں خواجہ ایزد بخش انصاری کے گھر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کی معمولی ملازمت تھی اس لئے گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ حالی نے سب سے پہلے مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں مولوی نوازش علی سے عربی' فارسی' فقہ اور منطق کی تعلیم پائی۔ نو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے پرورش کی اور شادی کروائی۔ مگر حالی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی چلے گئے۔ پھر ۱۸۵۵ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پھر دہلی گئے۔ مرزا غالب سے فیض حاصل کیا اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد لاہور میں پنجاب بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ پھر اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس ہو گئے۔ وہاں سے سرسید احمد خان کے دبستان میں شامل ہوگئے۔ حیدر آباد دکن کی ریاست سے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں فوت ہوگئے۔

مولانا حالی نے نثر و نظم میں اُردو کی جو خدمت کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیات سادگی، وسعت، فطرت کی عکاسی اور حقیقت نگاری ہے۔ حالی نے اُردو ادب میں اصلاحی اور قومی نظموں کا اضافہ کیا۔

ان کی تصانیف میں یادگار غالب' حیات سعدی' حیاتِ جاوید' دیوانِ حالؔی' مسدّسِ حالؔی (مدّ و جزرِ اسلام) مقدمہ شعر و شاعری' مجالس النساء زیادہ مشہور ہیں۔

# اسلام میں گداگری کی مذمت

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو مضمون نویسی کے رموز سکھانا۔
۲۔ طلبہ کو آگاہ کرنا کہ اسلام گداگری کی شدید مذمت کرتا ہے۔
۳۔ طلبہ کو آگاہ کرنا کہ گداگری معاشرے کیلئے زہرِ قاتل ہے۔
۴۔ طلبہ پر آرام طلبی کی بجائے محنت اور کام کی اہمیت واضح کرنا۔
۵۔ طلبہ کو حالی کی ادبی نثر سے روشناس کروانا۔

**مشکل الفاظ:** اپاہج ، ادنیٰ ، اسراف ، اقتصادیات ، انسداد ، الوالعزمی

بھیک مانگنے کی جس قدر مذمت اسلام میں کی گئی ہے شاید ہی کسی مذہب میں اس کی اس قدر برائی کی گئی ہوگی۔ سوال کے انسداد کو رسولِ خدا ﷺ اس قدر مہتمم بالشان تصور فرماتے تھے کہ جس طرح آپ توحید اور نماز پنج گانہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح لوگوں کو سوال سے باز رکھنے میں ہمت عالی مصروف رکھتے تھے۔ چنانچہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپؐ نے ہم سے فرمایا ''کیا تم خدا کے رسول سے بیعت نہیں کرتے''؟ ہم نے فوراً ہاتھ بڑھایا' مگر چونکہ ہم چند روز پہلے بیعت کر چکے تھے' ہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ! ہم ابھی بیعت کر چکے ہیں' آپ ﷺ ہم سے کس بات پر بیعت لیتے ہیں''؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''اس بات پر کہ خدا کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور احکامِ الٰہی بجالاؤ'' اور پھر آہستہ سے ارشاد فرمایا ''لَاتَسْـاَءَ لُوْا النَّاسَ شَيْئًا '' (یعنی لوگوں سے کچھ نہ مانگو) اس روایت کے بعد عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد ان لوگوں میں سے (جنہوں نے بیعت کی تھی) بعض کو دیکھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے سواری کی حالت میں کوڑا بھی گر جاتا تھا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں یہ بھی سوال میں داخل نہ ہو' کسی راہ چلتے سے اپنا کوڑا نہ مانگتا تھا''۔

سوال نہ کرنے کی اس قدر تاکید صرف اسی واسطے کی گئی ہے کہ گداگری پیشہ نہ ہو جائے اور اسے آج کل کی طرح ذریعہ معاش نہ بنالیا جائے۔ کیونکہ دوسری حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ ''ایک دوسرے کی مدد کرو اور اپنے کاموں

میں دوسرے بھائیوں سے مشورہ لو' اور جیسے زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ لینے کی حدیثیں ہیں۔ جیسے اُس وقت بعض رقوم کو قوم سے وصول کر کے اسلام کی ضروری خدمات کے صرف کے واسطے بیت المال میں جمع رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر اب بھی قوم کی اہم ضروریات کے واسطے روپیہ فراہم کیا جائے تو یہ گداگری نہیں ہے اور نہ ہی یہ ''لَاتَسَاءَ لُوْا النَّاسَ شَيْئًا'' میں آسکتا ہے۔ ورنہ اگر ''کچھ نہ مانگو'' کے مطلق معنی مراد لئے جائیں تو دنیا کا سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیعت مذکور کا اصل مقصد خاص کر سوال کرنے کی برائی ان کے ذہن نشین کرنی تھی۔ جن باتوں کی تصریح پہلی بیعت میں فرما چکے تھے۔ ان کی تکرار اس موقع پر بطور یاددہانی کے تھی' نہ کہ اصل مقصود۔ نیز بیعت کرنے والوں کا ''بعد بیعت کے'' سوال سے اس قدر بچنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیعت کا اصل مقصد صرف سوال کرنے کی ممانعت تھی اور بس۔

بے شمار روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سائل سے نہایت نفرت کرتے اور جو شخص بغیر اضطراری حالت کے سوال کے ذریعے سے کچھ وصول کرتا تھا اس کو اس کے حق میں حرام سمجھتے تھے۔ جو شخص ایک وقت کی بھی خوراک موجود ہونے پر سوال کرے اس کی نسبت فرماتے کہ ''وہ اپنے لئے کثرت سے آتش دوزخ طلب کرتا ہے''۔

آنحضور ﷺ نے بار بار فرمایا ہے کہ:

''ہم میں سے جو شخص اپنی رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے اور اس کو فروخت کرے تاکہ خدا تعالیٰ اس کی حاجت رفع کر دے' یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگے' پھر وہ اس کو کچھ دیں یا دھتکار دیں''۔

عائذ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر تم لوگ جانو کہ سوال کرنے کے کیا نتائج ہیں تو کوئی شخص سوال کرنے کے لئے دوسرے شخص کی طرف رُخ نہ کرے''۔

اگر کوئی فلاسفر یا اکانومسٹ (ماہر اقتصادیات) اس مطلب کو بیان کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ:

''جس قدر قوم میں بھیک مانگنے والوں کی کثرت زیادہ ہو جاتی ہے اسی قدر قوم کی دولت میں' محنت و جفاکشی میں' غیرت وحمیت میں' ہمت و اولوالعزمی میں گھاٹا ہوتا جاتا ہے۔ مفلسوں کو کاہلی اور بے غیرتی کی ترغیب ہوتی ہے اور دولت مندوں کا بہت سا روپیہ ایسی جماعت کی تعداد بڑھانے اور تقویت دینے میں صرف ہوتا ہے جن کا وجود سوسائٹی کے حق میں سَمِّ قاتل کا حکم رکھتا ہے''۔

مگر جو جامعیت مذکورہ بالا حدیث نبوی میں پائی جاتی ہے' وہ اس فلاسفر یا اکانومسٹ کے اس لمبے چوڑے

بیان میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔

حدیث کے الفاظ جس طرح مذکورہ بالا سوشل (معاشرتی) اور مورل (اخلاقی) خرابیوں میں شامل ہیں‘ اسی طرح ان تمام روحانی آفتوں اور بیماریوں پر حاوی ہیں جو سوال کی مذموم عادت سے سائل کو عارض ہوتی ہیں۔

سائل خدا کو صرف بھیک مانگنے کا ایک اوزار جانتا ہے جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ’’مَلْعُوْنٌ مَنْ سَاَلَ لِوَجْہِ اللّٰہ‘‘۔ (ترجمہ) ’’لعنت ہے اس شخص پر جس نے اللہ کے نام پر مانگا‘‘۔

اس کے دل میں نبی ﷺ کی عظمت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ جب خدا کے ساتھ رسول ﷺ کا بھی واسطہ دیا جاتا ہے تو ایک مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔

سائل اپنے اندوختے کو‘ جو بھیک کے ذریعے سے اس نے پیدا کیا ہے‘ چھپاتا ہے اور باوجود استطاعت کے اپنی ناداری کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح کفرانِ نعمت‘ دروغ گوئی اور مکاری کے سخت ترین گناہوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ گردانتا ہے۔

پس جن جامع الفاظ میں رسول خدا ﷺ نے بھیک مانگنے کی مذمت فرمائی ہے اس سے زیادہ جامع الفاظ سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یہاں ایک بات قابلِ غور ہے یعنی یہ کہ رسول خدا ﷺ نے سوال کرنے پر تو اس قدر لے دے کی ہے کہ بے شمار حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ ادنیٰ تامل سے معلوم ہوسکتی ہے۔

چونکہ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنا زیادہ تر سوشل (معاشرتی) خرابیوں کا موجب تھا اور سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتی تھی۔ اس لئے رسولِ خدا ﷺ نے جس صراحت کے ساتھ سوال کی مذمت فرمائی‘ ویسی صراحت کے ساتھ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مذمت نہیں فرمائی۔

بہ ایں ہمہ اگرچہ آپ نے علی الاعلان غیر مستحق سائلوں کا سوال رد کرنے کی تاکید نہیں فرمائی لیکن خود سوال کرنے کی اس قدر مذمت کرنے سے صاف پایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ ملک میں سائلوں کی تعداد بڑھنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز سائلوں کی تعداد بڑھانے والی ایسی نہیں ہے جیسے ہر مستحق و غیر مستحق سائل کا سوال پورا کرنا۔

اس کے سوا متعدد روایتوں کے فحوائے کلام سے پایا جاتا ہے کہ آپ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے سے خوش نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ’’قسم ہے خدا کی جو (غیر مستحق) سائل میرے پاس سے اپنا مطلب حاصل کر کے لے جاتا ہے وہ مطلب نہیں ہے اس کے حق میں مگر ایک آگ‘‘۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ

نے عرض کیا کہ ''آپ ﷺ کیوں اس کا مطلب پورا کرتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا، کیا جائے؟ لوگ تو مانتے نہیں اور خدا تعالیٰ ردسوال کو مجھ سے پسند نہیں کرتا''۔

لیکن اس بات میں سب سے عمدہ ''مشکوۃ'' کی وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے سائل کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ یعنی انصار میں سے ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا ''کیا تیرے گھر میں کچھ بھی نہیں؟'' اس نے عرض کیا ''کیوں نہیں' ایک موٹی سی کمبلی ہے' اسے کچھ اوڑھتا ہوں' کچھ بچھاتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''دونوں کو میرے پاس لے آ''۔ وہ دونوں آپ ﷺ نے ان کو ہاتھ میں لے کر لوگوں سے فرمایا ''ان کو کوئی خریدتا ہے؟'' پھر آپ ﷺ نے دو یا تین بار فرمایا ''کوئی ایک درہم سے زیادہ دے سکتا ہے؟'' ایک شخص نے کہا ''میں دو درہم دیتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے وہ کمبلی اور پیالہ اسے دے کر دو درہم لے لئے اور اس انصاری سے فرمایا کہ ایک درہم کا تو کھانا لے جا کر اپنے گھر میں پہنچاؤ اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ وہ کلہاڑی خرید لایا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے ایک لکڑی کا دستہ اس میں ٹھونک دیا اور فرمایا ''جا لکڑیاں کاٹ اور بیچ۔ اب میں تجھ کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں''۔ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بیچنے لگا۔ پندرہ دن کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے۔ اس نے ان میں سے کچھ کا تو کپڑا خریدا اور کچھ سے کھانے کا سامان مول لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ جب تو قیامت کے دن آئے تو تیرے چہرے پر بھیک مانگنے کا داغ ہو۔ دیکھ' سوال کرنا صرف اس شخص کو حلال ہے جو سخت محتاج ہو یا جس کے ذمہ بھاری تاوان ہو یا جس کی گردن پر خون بہا ہو''۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سائل کو سوال کرنے سے روکا جائے اور سوال کرنے کی برائی اور محنت و مشقت کرنے کی خوبی اس کے ذہن نشین کی جائے۔ مگر اس زمانے کے سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اتنی حد سے گزر گئی ہے کہ کسی کی فہمائش یا ممانعت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ نظر بہ حالات موجودہ ہم کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ غیر مستحق سائلوں کی داد و دہش سے یک قلم ہاتھ روک لیا جائے اور جہاں تک ہو سکے مستحقین کی امداد کی جائے جو باوجود استحقاق کے کسی سے سوال نہیں کرتے یا جو سخت مجبوری اور ناداری کی حالت میں سوال کرتے ہیں۔ غیر مستحق سائلوں کے ساتھ کوئی سلوک اور کوئی بھلائی اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی کہ ان کو اس بے غیرتی اور بے شرمی کے پیشے سے باز رکھا جائے۔

ملک وقوم کے حق میں کوئی احسان اس وقت اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا کہ بھیک مانگنے کا بدترین پیشہ، جو مرض متعدی کی طرح افرادِ قوم میں سرایت کرتا جاتا ہے اور جس سے روز بروز بھیک منگوں کی تعداد ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جائے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد مدت دراز تک ممالک اسلامیہ میں سوال کرنا نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا اور طرح طرح سے اس کا انسداد کیا جاتا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل کی آواز سنی اور یہ سمجھ کر کہ بھوکا ہے، اس کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی آواز پھر سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی سائل ہے اور کھانا کھانے کے بعد اب پھر مانگتا ہے۔ آپؓ نے اس کو بلوایا اور دیکھا کہ اس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی ہے۔ آپؓ نے جھولی کا ایک سرا پکڑ کر اس کو اونٹوں کے آگے جھاڑ دیا اور فرمایا ”تو سائل نہیں ہے، تاجر ہے“۔

علامہ مقرّی تاریخ اندلس میں لکھتے ہیں کہ ”اندلس میں جس سائل کو تندرست اور کام کے لائق دیکھتے ہیں، اس کو نہایت ذلیل کرتے اور سخت سست کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں اپاہج اور معذور آدمی کے سوا کوئی سائل نہیں نظر آتا“۔

مگر افسوس اور نہایت ہی افسوس ہے کہ اس زمانے میں ہر ایک جگہ جس قدر مسلمان بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، اس قدر اور کسی قوم کے آدمی نظر نہیں آتے۔ پس سب سے پہلے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حدود اور اختیارات میں جہاں تک ان کی دسترس ہو، اس نالائق اور کمینہ رسم کا انسداد کریں۔

خاص کر ہمارے علماء اور واعظین کو لازم ہے کہ نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ وعظ کی مجلسوں میں سوال کی مذمت، جو حدیثوں میں وارد ہوئی ہے اور جو مضر نتیجے سائلوں کی کثرت سے قوم کے حق میں پیدا ہوتے ہیں اور اسراف اور فضول خرچی کی برائی جو قرآن مجید میں جابجا بیان ہوئی ہے عام مسلمانوں کے ذہن نشین کریں۔

خاص کر زنانی مجلسوں میں عورتوں کو، جو ہر فقیر کو مستجاب الدعوات اور اس کی آواز کو غیب کی آواز سمجھتی ہیں، ان لوگوں کے مکر وفریب سے آگاہ کرنا چاہیے۔ ان کے دلوں میں بٹھا دیا جائے کہ ہٹے کٹے بھیک مانگنے والوں کو کچھ دینا بجائے نیکی اور بھلائی کرنے کے الٹا گناہ کا مرتکب ہونا ہے۔ کیونکہ جس قدر ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے اسی قدر مستحق بیواؤں، یتیموں اور ہمسایوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسی قدر بھیک مانگنے کا ناپسندیدہ طریقہ زیادہ رواج پاتا ہے اور اسی قدر قوم میں کام کے آدمیوں کی کمی ہوتی ہے۔

(مقالاتِ حالؔی)

# مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

(الف) گداگری کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان کیا ہے؟

(ب) جب ایک انصاری نے آپ ﷺ سے کچھ مانگا تو اِسے گداگری کی لعنت سے بچانے کے لئے کیا طریقہ تعلیم کیا گیا ہے؟

(ج) حضور ﷺ نے گداگری کے متعلق آسان لفظوں میں کیا فرمایا ہے؟

(د) گداگری کے انسداد کے لیے مصنف مولانا حالؔی نے کیا تجاویز پیش کی ہیں؟

(ہ) حضور ﷺ نے سوال کرنے سے کیوں منع فرمایا؟

(و) ''کیا تم خدا کے رسول سے بیعت نہیں کرتے؟''

اس جملے سے کیا مراد ہے؟

(ز) علامہ مقری ''تاریخ اُندلس'' میں کیا لکھتے ہیں؟

(ح) غیر مستحق سائلوں کے بارے میں طبقہ نسواں میں کیا توہمات پائے جاتے ہیں اور اِس سلسلے میں کیا اقدامات کرنے کی ضرورت ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ ومحاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

ہمت عالی۔ بیخ کنی کرنا۔ عارض ہونا۔ زم۔ مرض متعدی۔ مدح۔ الوالعزمی۔ ڈھٹائی۔ موجب۔ اپاہج

۳۔ حوالہء متن دیکر درج ذیل پیراگراف کی سلیس اُردو تحریر کریں۔

ملک وقوم کے حق میں کوئی احسان اس وقت اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا کہ بھیک مانگنے کا بدترین پیشہ' جو مرض متعدی کی طرح افرادِ قوم میں سرایت کرتا جاتا ہے اور جس سے روز بروز بھیک منگوں کی تعداد ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے' رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جائے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد مدت دراز تک ممالک اسلامیہ میں سوال کرنا نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا

۴۔ ''گداگری معاشرے کے لیے زہر قاتل ہے'' اس موضوع پر ایک صفحے کا مضمون تحریر کریں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کو چاہیئے کہ سبق پڑھانے سے پہلے طلبہ پر واضح کریں کہ اسلام نہ صرف ایک مذہب بلکہ ضابطہ حیات ہے۔

۲۔ طلبہ کو آگاہ کریں کہ گداگری کس طرح معاشرے کے لئے نقصان دہ ہے۔

۳۔ سبق پڑھا کر اپنے اِردگرد کے ماحول سے مثالیں دے کر گداگری کی حوصلہ شکنی کریں۔

۴۔ سبق میں موجود حالی کی نثری اسلوب کی خصوصیات بتائی جائیں۔ ۵۔ نئے اور مشکل الفاظ کے مفہوم بتائے جائیں۔

# مولانا شبلی نعمانیؒ

مولانا شبلی نعمانیؒ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ یہیں قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر غازی پور، رام پور اور لاہور میں دوسرے علوم حاصل کیئے، جن میں عربی ادب، منطق و فلسفہ اور علم حدیث وغیرہ شامل ہیں۔ سرسید نے ان کی ذہانت دیکھ کر علی گڑھ کالج میں شعبہ عربی و فارسی کی پروفیسری کی جگہ دی۔

۱۸۹۲ء میں انہوں نے ترکی اور دیگر چھ ممالک کا دورہ کیا اور اپنا مشہور ''سفرنامہ'' اسی سفر کی بنیاد پر لکھا۔ ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ میں ''دارالمصنفین'' قائم کیا۔ یہ ادارہ اب تک علمی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

شبلیؒ، سرسید کے رفقا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں خصوصاً نثر میں ان کا مرتبہ بلند ہے۔، ان کی عبارتوں کا اختصار، جوش بیان اور علمی وقار، کچھ انہی سے مخصوص ہے۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی اور قوت ہوتی ہے۔ وہ نثر میں استعارے کا استعمال بہت کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خوبصورت فارسی ترکیبیں نہایت پرلطف معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کا بیان شعر کی طرح رسیلا ہو جاتا ہے۔ سرسید کے دوسرے رفقا کی طرح شبلیؒ کی تحریر میں بھی عقلیت اور مقصدیت کا ایک خاص انداز نمایاں ہے، یعنی وہ اس خاص نقطہ نظر کو بار بار ابھارتے ہیں کہ انسانی زندگی میں عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مقصدیت سے مراد یہ ہے کہ وہ ادب کے لئے مقصد کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا بڑا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب کو نئے لوگوں کے سامنے اس طریق سے پیش کیا جائے کہ ان کے دل میں ماضی سے متعلق احساس فخر پیدا ہو۔ جس سے متاثر ہو کر وہ اپنے حال اور مستقبل کو بہتر اور شاندار بنانے کی طرف متوجہ ہوں۔

نثر میں شبلیؒ کی کئی حیثیتیں ہیں۔ سوانح، سیرت نگاری، تاریخ، ادبی تنقید اور فلسفہ ان کے اہم موضوعات ہیں۔ مگر ان کی مورخانہ حیثیت فائق اور غالب معلوم ہوتی ہے۔ شبلی نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

# ہجرت نبوی ﷺ

(مولانا شبلی نعمانیؒ)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو حضور ﷺ کی سیرت اور اسلام کے اوائل میں مسلمانوں پر کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو مولانا شبلیؒ نعمانی کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔
۳۔ اُردو ادب میں سیرت نگاری سے آگاہی دینا۔

**مشکل الفاظ:** اشتہار ، تڑکے ، جاںنثار ، جبلِ نور ، جھنکار ، کارسازِ قضا

اس وقت جبکہ دعوت حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا، لیکن خود وجود اقدس جو ان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا۔ اپنے لیے حکم خدا کا منتظر تھا۔ مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحب اثر مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ جاںنثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے، قبیلہء دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا۔ اس کے رئیس طفیل بن عمروؓ نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں لیکن آپؐ نے انکار فرمایا کہ کارساز قضا نے شرف صرف انصار کے لیے مخصوص کیا تھا۔ چنانچہ قبل ہجرت آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا کہ دارالہجرۃ ایک پر باغ و بہار مقام ہے۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا۔

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہؓ مدینہ پہنچ چکے، تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ انہی سے سن کر کہا ہوگا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بناء پر انہوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جُبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلاۃ، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکم بن حزم، ابوجہل، امیّہ بن خلف وغیرہ وغیرہ،

یہ سب شریک تھے۔لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ایک نے کہا محمد ﷺ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کردیا جائے، دوسرے نے کہا جلا وطن کردینا کافی ہے، ابوجہل نے کہا ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کردے۔اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کرسکیں گے۔اس اخیر رائے پر اتفاق ہوگیا اور جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ ﷺ کے آستانہء مبارک کا محاصرہ کرلیا۔اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے اس لیے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت ﷺ نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ سے قریش کو اس درجے عداوت تھی تاہم آپ ﷺ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لاکر رکھتا تھا۔اس وقت بھی آپ ﷺ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔آپ کو قریش کے ارادے کی پہلے سے خبر ہوچکی تھی۔اس بناء پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا ''مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا''۔ یہ سخت خطرے کا موقع تھا۔حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ ﷺ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ ﷺ کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبرؓ کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازے پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا ''کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو''۔ بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہوچکی تھی۔آپ ﷺ نے فرمایا مجھ کو ہجرت کی اجازت ہوچکی ہے۔حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا۔میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا؟ ارشاد ہوا، ہاں! حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینے سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں۔محسن عالم ﷺ کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہوسکتا تھا۔ارشاد ہوا ''اچھا مگر بہ قیمت''۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا۔حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں۔ان کی بڑی بہن اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا۔دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔یہ وہ شرف تھا جس کی بناء پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

کفارِ نے جب آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت ﷺ ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا مکہ تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔ حضرت ابو بکرؓ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی۔ دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کی غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ ہوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں؟ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت ﷺ سے عرض کرتے۔ حضرت ابو بکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی۔ لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت ﷺ کے بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی اب دشمن اس قدر قریب آ گئے کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (سورۃ التوبہ)

''گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے''

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو اللہ نے حکم دیا دفعتہً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپا لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے۔ حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو ''مواہب لدُنیّہ'' میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

بہرحال چوتھے دن آپ ﷺ غار سے نکلے۔ عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا رہنمائی کے لئے اُجرت پر مقرر کر لیا گیا۔ وہ آگے آگے راستہ بتاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابو بکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایے میں آرام فرما لیں۔ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اُتر کر زمین جھاڑی پھر اپنی چادر بچھا دی۔ آنحضرت ﷺ نے آرام فرمایا تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔ اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار

سے صاف کر دے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہایا۔ برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑ جائے۔ دودھ لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا۔ آپ نے پی کر فرمایا کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا؟ آفتاب اب ڈھل چکا تھا اس لیے آپ وہاں سے روانہ ہوئے۔

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک خوں بہا کے برابر (یعنی سو اُونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم نے سنا تو انعام کی اُمید میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپ ﷺ روانہ ہو رہے تھے۔ اس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا، ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیئے یا نہیں؟ جواب میں ''نہیں'' نکلا۔ لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا۔ اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اُتر پڑا اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا۔

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کیے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا۔ معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر ﷺ آ رہے ہیں۔ لوگ ہر روز تڑکے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ ''اہلِ عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا''۔ تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا۔ انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے۔

(سیرت النبی ﷺ)

# مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

(الف) حضورﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم کیوں دیا؟

(ب) جب قریش نے مسلمانوں کو مدینہ میں طاقت پکڑتے دیکھا تو انہوں نے کیا کیا؟

(ج) قریش کے دارالشوریٰ میں کیا فیصلہ ہوا؟

(د) حضرت اسماءؓ کو ذات النطاقین کا لقب کیوں دیا گیا؟

(ہ) جب کفار غار جبلِ ثور کے قریب پہنچے تو اللہ کے حکم سے کونسا معجزہ رونما ہوا؟

(و) جب حضورﷺ کی آمد کی خبر مدینہ پہنچی تو لوگوں نے آپﷺ کی آمد کی کس طرح کی تیاری کی؟

۲۔ درج ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

محسنِ انسانیت، کارسازِ قضا، دارالامان، فرشِ گل

۳۔ درج ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں۔

عداوت، گوارا، خلائق، محبوس، رؤسا

۴۔ کالم (الف) میں دیئے گئے الفاظ کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

| کالم (الف) | کالم (ب) |
|---|---|
| دارالامان | سواُونٹ |
| دارالشوریٰ | درخت |
| ذات النطاقین | مدینہ |
| ببول | قریش |
| خون بہا | حضرت اسماءؓ |

۵۔ سبق ہجرت نبوی ﷺ سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

۶۔ بحوالہ متن درج ذیل پیراگراف کی سلیس اُردو تحریر کریں۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو اللہ نے حکم دیا دفعۃً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپا لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے۔ حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو "مواھب لدُنّیہ" میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو مکی اور مدنی زندگی کے درمیان فرق سے آگاہ کریں۔

۲۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں پر کیئے گئے مظالم سے آگاہ کریں۔

۳۔ شبلیؒ کی سیرت نگاری اور سوانح نگاری پر مختصر روشنی ڈالیں۔

# محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۳۰ء میں محمد باقر کے ہاں دلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ ایرانی خاتون تھیں۔ لہٰذا فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ وہ عربی بھی بخوبی جانتے تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی و فارسی اپنے والد سے حاصل کی پھر ابتداء میں ایک مکتب میں اور آخر میں دلی کالج میں داخلہ لیا۔ ان کے والد محمد باقر نے ۱۸۵۷ء میں دہلی سے پہلا اردو اخبار نکالا۔ یوں اسی ادبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔

آزاد اردو کے وہ مایہ ناز انشا پرداز ہیں۔ جن پر زبان اردو ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے بلکہ جدید اردو شاعری کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی۔ لیکن ان کی اصل شہرت ان کی نثر کی وجہ سے ہے اسی نثر کی وجہ سے انہیں اردو کا بہترین انشاء پرداز کہا جاتا ہے۔ وہ آزاد شاعر ہونے کے ساتھ نقاد، سوانح نگار، مؤرخ اور ایک مخصوص طرز کے نثر نگار تھے۔ ان کی کتابوں میں سخندان فارس، آب حیات، دربار اکبری اور نیرنگِ خیال زیادہ مشہور ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد دہلی سے دکن چلے گئے۔ واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ ۱۸۸۷ء میں اُن کو ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ آخری ایام میں وہ دماغی امراض میں مبتلا ہوئے اور اسی عالم دیوانگی میں ۱۹۱۰ء میں اُن کا انتقال دکن میں ہوا۔

# سیرِ زندگی

(محمد حسین آزاد)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلباء کو تخیلاتی نثر سے متعلق معلومات بہم پہنچانا۔
۲۔ طلباء کے لئے زندگی کی معنویت میں اضافہ کرنا۔
۳۔ طلباء کو آزاد کے اسلوب نثر سے متعارف کروانا۔

**مشکل الفاظ:** انبوہ ، بے لاگ ، حاجت ، رفاقت ، سکت ، گرداب

ایک حکیم کا قول ہے کہ ''زندگی ایک میلہ ہے'' اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے۔ جب اس فقرہ پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گزرے۔ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنٰی ادنٰی چیز کا محتاج ہے پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار ہوتا ہے۔ ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اس کا عاشق زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتاً درد و مصیبت کی فریاد خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔

اول تو دل بہت حیران ہوا۔ بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ اور اس غل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب کہاں جاتے ہیں۔ دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کچھ کشتیوں کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں کی غفلت سے کچھ ان کی بے وقوفی سے لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے۔ وہ نہر تو ہم اتر آئے ہیں۔ اب منجدھار سمندر ہے

اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے کبھی گرداب ہے۔ کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کئے ہیں جو رستہ بتانے اور پار اتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح کی فقط خدا کی آس ہے اور بس۔

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے نظر اٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوش نما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہر نہ کچھ زور تھا نہ شور تھا۔ مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا وہ اسے بلبلے کی طرح بہا لے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر میں بہتا چلا جاتا تھا اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں اور جا بجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بادِ مراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے۔ اور جو بیچارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر قہقہے اڑاتے جاتے تھے مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے اور موجوں کے تھپیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھا لانے کا تو کیا ذکر ہے اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے۔ کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آ جائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے۔ اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو اور ہمسفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے اور اپنی بدانجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اپنی مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی جو پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا تھا کہ اَلحَمدُ لِلّٰہ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا میں اس سے بچ جاؤں گا اور جن چٹانوں

نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے مگر اسی رستے چلے جاتے تھے۔اس بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سستی اور بے پروائی ان کی کچھ اس لئے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہوگئے تھے کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے۔ داد بیداد کرتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آؤ اور ہمیں سنبھالو۔اور اکثر آخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہتیرے نیم جان بہتیرے ایسی بے کسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ایک دوسرے کو ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا۔جس کشتی پر ہم سوار تھے حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اٹھانے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو جو مستِ غفلت زندگی کے نشہ سے سرخوش بیٹھے تھے وہ بھی غمگین ہوگئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلوں نامردوں کو زندگی عذاب موت ہوگئی۔ بلکہ رنج و غم کے بعد جن جن راحتوں کی امید ہوتی ہے۔اس سے بالکل مایوس ہوگئے مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطرہ تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے بلکہ سب کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطرے کا خیال دور ہی دور رہے اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی جو اٹھائی نہ جائیں گی وہ سامنے نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھتے تھے اس وقت کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے۔امید تو ہمیشہ اس رستے میں ساتھ ہی رہتی تھی اس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کو امید سے بہت راہ تھی ان سے اس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کر رکھے تھے مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی جس کے سہارے سے بھاگ کر بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدے پر راضی تھے۔ درحقیقت امید کی باتیں ان سے مسخرے پن کے طور پر تھیں کیونکہ

جتنی جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں اتنی ہی بے خبری کے عہد نامے تازہ کرتی تھیں اور تعجب یہ ہے کہ جنہیں ڈوبنے کا یقین تھا وہی کاروبار کے لئے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بہت بڑا جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارے پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا۔ اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا۔ ''بداعتدالیوں کا گلزار'' جہاں تک جزیرے کی حد تھی وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے۔ جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جتنی کھلی تھیں، نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔ جوانانِ مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ آرام وہیں اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا اور خوشی بیٹھے بیٹھے سروں میں پڑی ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہ گزر عام تھا۔ اس لئے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں میں ضرور طراوت دیتی تھی۔

ادراک کا ناخدا داہنے ہاتھ پر دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکڑے راستے سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی کھینچنے کے لئے ان سے ڈنڈا مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے تھے۔ خواہ وہ خفا ہو کر کہے، خواہ منتوں سے مانگے۔ تھوڑے ہی ہوں گے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیں اور عہد لے لو کہ پھر رستہ بھر ہم کہیں نہ اٹکیں گے۔ نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو درکنار ان بلاؤں کے پاس تو نکلنا بھی غضب ہے چھوا اور موا۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرہ مذکور کی طرف لے چلا اس جزیرے نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا۔ لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلی۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی، تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے اور نکلے تو جس طرح پہلے جاتے تھے اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے تلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے ادھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے مگر جو ڈوبتا تھا اپنی کوتاہ اندیشی پر

بہت پچھتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ۔

ے من نہ کردم شما حذر بکنید

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے ان کے کاریگر بھی وہیں موجود تھے۔ بہت لوگوں کو اپنی کاریگروں پر بڑا بھروسہ تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انہیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا مگر معلوم ہوا کہ جنہوں نے تھوڑا صدمہ اٹھایا تھا وہ بھی کچھ بہت نہ جئے روز بروز مرض بڑھتا گیا آخر ڈوب ہی گئے بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود ان کی مدد سے پہلو بچایا۔ مگر بہتیرے کاری گر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے۔

غرض سیر زندگی میں چالاک لوگوں نے بھی اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں کے ساتھ چلے آتے تھے انہیں غوطے کھاتے دیکھتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے یعنی بادمخالف برابر غرق کیے جاتی تھی۔ نہ ان بیچاروں کو محنت تدبیر کرنی پڑتی تھی نہ غم انتظار اٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت لڑے مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا کہ امید کو بھی کنارہ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل ایسا زندگی سے بیزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے دوربین الٰہی سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کہر جو دھواں دھار ہو رہی تھی اسے اپنی برکت سے اڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ صبح صادق کا وقت ہے۔ چمن کے لہلہے، مرغان سحر کے چہچہے، پھولوں پر شبنم، صبا اور نسیم کم کم، جزیرے کے جزیرے میوؤں سے جھومتے اور پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے امرا، شرفا، خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق لباس پہنے پھولوں کے طرے سر پر، ہار گلے میں ڈالے ادھر ادھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار اور رسیلی آوازوں کی تانوں نے وہ جھمکٹ کر رکھا تھا کہ شور قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔

---

ا ترجمہ:۔ میں نہیں بچ سکا لیکن تم اس سے بچو۔

اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغر دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آ جائیں تو اڑوں اور اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں، لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں۔ الا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں اور سمندر کے قالین پر گلکاری کر رہے ہیں۔ حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری نظر کام کر سکے بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے اس سے بھی آگے تک لا انتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحب دلوں کے گھر یہیں ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو جی چاہے اور طبیعت اٹھائے سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکین کے لائق شان ہے کیوں آزاد کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دیجئے اور انہیں لیجئے؟ کیا اس زندگی کو مصیبت سمجھنا چاہئے جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ کیا موت سے ڈرنا چاہئے؟ کیا ملک عدم کو خوش ہو کر نہیں چلنا چاہئے۔ جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں اور سنتے ہو؟ یہ سمجھنا کہ انسان جس کے لئے یہ بے زوال سامان ہیں اسے یونہی پیدا کر دیا ہے؟ دنیا مقام امتحان ہے ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

(نیرنگ خیال)

## مشق

ا۔ درج ذیل سوالات کے جوابات تحریر کریں۔

(الف) سیر زندگی میں ایک حکیم کا کیا قول ہے؟

(ب) منجدھار سمندر سے کیا مراد ہے؟

(ج) مصنف نے خوش نما گلزار کے بیچ میں نہر کی جو حالت بیان کی ہے اُسے مختصراً لکھیں۔

(د) ملاح خطرے اور موت کو سامنے دیکھ کر پھر بھی کیوں بے خطر کشتی چلا رہے تھے؟

(ہ) ڈوبنے والے ساتھیوں کو آخری وقت میں کیا نصیحت کرتے تھے؟

(و) آفتوں کے چرچے کے بعد زندگی کے نشے میں مست افراد پر کیا بیتی؟

(ز) دریائے زندگی میں لوگوں کو بڑا جزیرہ کہاں نظر آیا؟

(ح) ادراک کا ناخدا مسافروں کو نکالنے میں کیونکر مدد کر رہا تھا؟

(ط) بیچ سمندر پانی کے طلاطم کا کیا عالم تھا؟

(ی) باغ فرح بخش میں مصنف نے کیا پایا؟

۲۔ ''میرا مقصدِ حیات'' کے عنوان پر مضمون تحریر کریں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ ومحاورات کے معنی لکھیں۔

حاجت ۔ غارت ۔ گرداب ۔ بے لاگ ۔ حواس ٹھکانے ہونا ۔ سکت ۔ انبوہ ۔ رفاقت

۴۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۵۔ مصنف کا نام، سبق کا عنوان اور حوالہ متن دے کر درج ذیل پیراگراف کو سلیس اُردو میں لکھیں۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرہ مذکور کی طرف لے چلا اس جزیرے نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا۔ لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلی۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی، تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے اور نکلے تو جس طرح پہلے جاتے تھے اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے طلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے ادھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔

۶۔ درج ذیل الفاظ کے جمع لکھیں۔

آفت ۔ حالت ۔ تماشہ ۔ حاجت ۔ قسم ۔ سبب ۔ منت

۷۔ درج ذیل تراکیب کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ اُن کے معنی واضح ہو جائیں۔

بادِمخالف ۔ دریائے زندگی ۔ مست غفلت ۔ بادِ مراد ۔ سیر زندگی

۸۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

مصیبت ۔ حیات ۔ غفلت ۔ حقیقت ۔ چرچا

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو زندگی میں پیش آنے والے مختلف حالات سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو زندگی گزارنے کا اصل مقصد بتائیں۔ ۳۔ محمد حسین آزاد کی نثر کے اسلوب کی خصوصیات سے آگاہ کریں۔

# ڈپٹی نذیر احمد

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ضلع بجنور (یو۔ پی بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم وفضل کے لئے معروف تھا۔ ان کے والد ناداری کی زندگی بسر کررہے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی۔ بعد میں تعلیم کا شوق انہیں دلّی لے آیا۔ یہاں مولوی عبدالخالق کے حلقہء درس میں داخل ہوئے اور انہیں کی مسجد میں رہنے لگے۔ بعد میں دلّی کالج میں داخل ہوگئے۔ وہاں سے ادب عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی بھی شروع کی، مگر والد کے منع کرنے سے اُدھوری رہ گئی جو بعد میں انہوں نے از خود پڑھی۔ کالج میں ان کے ساتھ محمد حسین آزادؔ، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوبؔ تھے۔

ملازمت کا آغاز کنجاء ضلع گجرات (پنجاب) میں مدرس کی حیثیت سے کیا۔ بعد میں ترقی کر کے انسپکٹر مدارس ہوگئے۔ پھر تحصیل دار اور بعد میں افسر بندوبست ہوئے۔ اس کے بعد ریاست حیدرآباد چلے گئے اور کئی سال کی ملازمت کے بعد اعلیٰ رکن مال بہ مشاہرہ سترہ سو روپے پر ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور دلّی میں آکر باقی زندگی تصنیف وتالیف میں بسر کی۔ ۱۸۹۷ء میں آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل اور اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔

نذیر احمد کو اُردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ نذیر احمد کے لکھے ہوئے قصوں میں ایسی چیزیں موجود ہیں کہ اُنہیں ناول کا نقش اوّل کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے تمام ناول مقصدی ہونے کے باوجود بہت دلچسپ ہیں۔ انہوں نے ادب کو برائے زندگی پیش کیا ہے۔ نذیر بامحاورہ اُردو لکھنے کے بادشاہ ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں دہلی میں وفات پائی۔

# ایثار

(ڈپٹی نذیر احمد)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو ڈپٹی نذیر احمد کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ میں ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کرنا۔

۳۔ بنیے کے نارواعمل سے آگاہی۔

**مشکل الفاظ:** آنکنا ، اِجت ، پیادہ ، پنڈ چھڑاؤ ، بلائیں لینا ، بنیا

ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھ کو اماں جان نے بنادی تھی۔ وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے میں خالہ جان کے یہاں جاتا تھا۔ میاں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپڑاسی، پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی وہاں جمع تھے۔ یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں جا گھسا۔ تو معلوم کیا ہوا کہ ایک نہایت غریب، بوڑھی سی عورت ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں۔ سرکاری پیادے اس کے میاں کو پکڑے لیے جاتے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے کسی بنیے کے یہاں سے ادھار کھایا تھا اور بنیے نے اس پر ڈگری جاری کرائی تھی۔ وہ مرد مانتا تھا کہ قرضہ واجب ہے، مگر کہتا تھا کہ میں کیا کروں؟ اس وقت بالکل تہی دست ہوں۔ ہر چند اس بے چارے نے بنیے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری ہی خوشامد کی، مگر نہ بنیا مانتا تھا نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑے لیے چلے جاتے تھے۔ لوگ جو وہاں کھڑے تھے، انہوں نے بھی کہا ''لالہ! جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا، دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ''۔ بنیا بولا! ''اچھی کہی، میاں جی، اچھی کہی۔ برسوں کا نانواں اور روج کی ٹال مٹول۔ بھگوان جانے، ابھی تو کھان صاحب کی اِجت اُتروائے لیتا ہوں۔'' وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی۔ غریب تو تھا لیکن غیرت مند بھی تھا۔ بنیے نے جو عزت اتروانے کا نام لیا۔ سرخ ہو گیا اور گھر میں گھس تلوار میان سے نکال، چاہتا تھا کہ بنیے کا سر الگ کر دے کہ اس کی بیوی اس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی ''خدا کے لیے، کیا غضب کرتے ہو؟ یہی تمہارا غصہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچوں پر ہاتھ صاف کرو۔ کیونکہ تمھارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔'' ماں کو روتا دیکھ بچے اس طرح دھاڑیں مار مار کر روئے کہ میرا دل ہل گیا اور دوڑ کر سب

کے سب باپ کو لپٹ گئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر خاں صاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان کر کھونٹی سے لٹکا دیا اور بیوی سے کہا "اچھا، تو نیک بخت، پھر مجھ کو اس بے عزتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔" بی بی نے کہا، "بلا سے جو چیز گھر میں ہے، اس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ہوگی، دیکھی جائے گی۔"

توا، چکی، پانی پینے کا کٹورا، نہیں معلوم کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں، بس یہی اس گھر کی کل کائنات تھی۔ چاندی کی دو دو چوڑیاں، لیکن ایسی پتلی جیسے تار، اس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ سب سامان خاں صاحب نے باہر لا کر اس بنیے کے رُو برو رکھ دیا۔ اول تو بنیا ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سنا، یہاں تک کہ ان سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا۔ انہوں نے بھی بنیے کو سمجھایا۔ بارے خدا خدا کر کے وہ اس بات پر رضا مند ہوا کہ پانچ روپیا اصل اور دو روپیا سود۔ ساتوں کے ساتوں دے دیں تو فارغ خطی لکھ دے۔ لیکن خاں صاحب کا کل اثاثہ چار ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ڈھائی روپے کی کسر رہ گئی ہے۔ بی بی نے کہا، "اب تو کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں۔ ہاں لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں۔ دیکھو جو ان کو ملا کر پوری پڑے۔"

وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی۔ بس بعینہٖ جتنی ہماری حمیدہ۔ ماں جو لگی اس کی بالیاں اُتارنے، تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل میں کہا کہ الٰہی! اس وقت مجھ سے کچھ بھی اس کی مدد نہیں ہوسکتی۔ فوراً دل میں آیا کہ ایک روپیا اور کوئی دو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں۔ دیکھوں، ٹوپی بک جائے تو شاید خاں صاحب کا سارا قرضہ چُک جائے۔ بازار تو قریب تھا ہی۔ فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال تو سر سے لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے، ایک گوٹے والے کو دکھائی۔ اس نے چھ کی آنکی۔ میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا، "لا، بلا سے چھ ہی دے۔" غرض چھ وہ اور ایک میرے پاس نقد تھا ہی، ساتوں روپے لے، میں نے چپکے سے اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ تب تک پیادے خاں صاحب کو گرفتار کر کے لے جا چکے تھے اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتہً پورے سات روپے ہاتھ میں دیکھ، اس عورت پر ایک شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس خوشی میں اس نے کچھ نہیں سوچا کہ یہ روپیا کیسا ہے اور کس نے دیا ہے؟ فوراً اپنے ہمسائے کو روپیا دے کر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ بات کی بات میں خاں صاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو کیسی خوشی، کہ کودیں اور اُچھلیں۔ کبھی باپ کے کندھے پر اور کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پر ایک۔

اب اس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوں سے بولی کہ ''کم بختو! کیا اودھم مچاتے ہو۔ (اور میری طرف اشارہ کر کے کہا) دعا دو اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو۔ جس نے آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں۔ نہیں تو ٹکڑا بھی مانگے نہ ملتا۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اس کو تمھارا درد ہوتا اور اس مصیبت کے وقت تمھاری دست گیری کرتا۔ صرف ایک باپ کے دم کا سہارا، کہ اللہ رکھے، اس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو محنت سے مزدوری سے، خدا کا شکر ہے، روکھی سوکھی روز کے روز، دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت، مل تو جاتی ہے۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے، رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان نہ پہچان، نہ رشتہ نہ ناتا۔ اور اس اللہ کے بندے نے بھر مٹھی روپے دے کر آج ہم سب کو نئے سرے سے زندہ کیا''۔

وہ بچے جس شکر گزاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے، اس کی مسرت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں۔ روپیا خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی، جیسی کہ اس دن تھی۔ مگر دونوں میاں بی بی کے ذہن میں اس وقت تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیا ان کو دے دیا۔ وہ سمجھے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے۔ وہ عورت مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی۔ میں ہر چند منع کرتا رہا، جلدی سے اس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ، مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میاں سے بولی، ''نوج! کوئی تم جیسا بے خبر ہو۔ کھڑے کیا ہو؟ ایک گلوری بازار سے میاں کے لیے لگوا لاؤ۔''

میں: نہیں۔ میں پان نہیں کھاتا۔ تکلیف مت کرو۔

عورت: بیٹا، تمھاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف؟ جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمھارے تلووں میں بچھا دوں۔ قربان اس پیاری پیاری صورت کے۔ نثار اس بھولی بھولی شکل کے۔ بیٹا، تم یہ بتاؤ کہ تم ہو کون؟

میں: میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں۔

عورت: پھر بیٹا، یہ اپنا روپیا تم ہم سے کب لو گے؟ ہم اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمھارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے۔ مگر کام ان دنوں مندا ہے۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑے گا، دو ہی مہینے میں۔ مگر جہاں تم نے اتنی مہربانی کی ہے، للہ اتنا سلوک اور کرو کہ دو روپیا مہینا لے لیا کرو۔

میں: آپ روپے کے ادا کرنے کی کچھ فکر نہ کیجیے۔ میں نے لینے کی نیت سے نہیں دیا۔

یہ سن کر تمام خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور میں ان میں اس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جیسے خوش دل اور شکر گزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقہ مریدانِ ارادت مند میں کوئی پیر و مرشد۔ اس عورت کے منہ سے مارے خوشی اور شکر گزاری کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی اور آنکھوں

سے لگاتی تھی۔ اسی کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں۔ پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیا دیا۔ پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ بچھی جاتی تھی۔ سات روپے کی بھی کچھ حقیقت تھی، مگر اس نے مجھ کو سینکڑوں، ہزاروں ہی دعائیں دی ہوں گی۔ اس نے جو اتنی احسان مندی ظاہر کی تو میں الٹا اسی کا ممنون ہوا۔ جس قدر خوشامد کرتی تھی میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی، میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔

(توبتہ النصوح)

# مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

(الف) چپڑاسیوں اور پیادوں نے گھر کو کیوں گھیرے میں لیا تھا؟

(ب) بنیئے نے غریب آدمی پر ڈگری کیوں جاری کرائی تھی؟

(ج) سرکاری پیادوں کو غریب آدمی پر کیوں رحم آیا؟

(د) لڑکی کیوں روئی؟

(ہ) لڑکے نے ٹوپی کیوں بیچی؟

۲۔ ذیل الفاظ کے معانی لکھیں۔

تہی دست، حسرت، ایثار، کسر، بعینہٖ

۳۔ اعراب لگائیں۔

روبرو، ارادت، وقعت، اجت اتروانا، ممنون

۴۔ دیے ہوئے محاورات کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ معانی واضح ہوں۔

اودھم مچانا، کیفیت طاری ہونا، دھاڑیں مار مار کر رونا، بلائیں لینا، ٹال مٹول سے کام لینا

۵۔ اس کہانی کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۶۔ سبق کے متن کو پیش نظر رکھ کر خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) بلا سے جو چیز گھر میں ہے۔ اس کو دے کر کسی طرح اپنا.................. چھڑاؤ۔

(ب) سب سامان خاں صاحب نے باہر لا کر بیٹے کے .................. رکھ دیا۔

(ج) وہ لڑکی کوئی .................. برس کی تھی۔

(د) خاں صاحب کا کل اثاثہ .................. سے زیادہ نہ تھا۔

(ہ) لڑکے کی ٹوپی .................. کی بکی۔

(و) پورے سات روپے دیکھ کر عورت پر ایک .................. کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

(ز) روپیہ خرچ کرنے کے بعد لڑکے کو عمر بھر ایسی .................. نہیں ہوئی تھی، جیسی اُس دن تھی۔

۶۔ درج ذیل پیراگراف کی سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح کریں۔

یہ سن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور میں ان میں اس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جیسے خوش دل اور شکر گزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقہ مریدانِ ارادت مند میں کوئی پیر و مرشد۔ اس عورت کے منہ سے مارے خوشی اور شکر گزاری کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی اور آنکھوں سے لگاتی تھی۔ اسی کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں۔ پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیا دیا۔ پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ بچھی جاتی تھی۔ سات روپے کی بھی کچھ حقیقت تھی، مگر اس نے مجھ کو سینکڑوں، ہزاروں ہی دعائیں دی ہوں گی۔ اس نے جو اتنی احسان مندی ظاہر کی تو میں الٹا اسی کا ممنون ہوا۔ جس قدر خوشامد کرتی تھی میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی، میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ استاد طلبہ کو ناول کے اجزاء سے آگاہ کریں۔

۲۔ ڈپٹی نذیر احمد کے دیگر ناول بھی بتادیں۔

۳۔ طلبہ کو اُردو ادب میں ناول کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

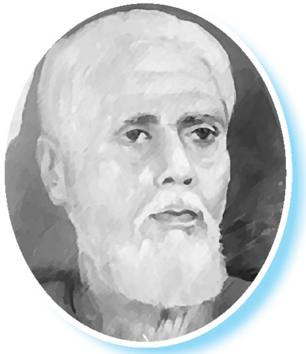

# قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب ۱۹۱۷ء میں گلگت میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پرنس آف ویلز کالج جموں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا اور بنگال میں تعینات ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آئے۔ پہلے منسٹری آف کامرس میں ڈپٹی سیکرٹری اور بعد میں مظفرآباد آزاد کشمیر میں چیف سیکرٹری تعینات ہوئے۔ وہ سابق صدور اسکندر مرزا اور ایوب خان کے پرنسپل سیکرٹری بھی رہے۔ کچھ عرصہ نیدرلینڈ میں پاکستان کے سفیر رہے۔

قدرت اللہ شہاب نے بچپن ہی سے اُردو اور انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے ریڈر ڈائجسٹ لندن کے زیرِاہتمام منعقد ہونے والے مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ لیا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ عرصہء دراز تک وہ پاکستان کے کئی اخبارات اور میگزین کے لیے اُردو اور انگریزی میں مضامین لکھتے رہے۔

اُن کی اہم تصنیف ''شہاب نامہ'' ہے جو وہ آخری عمر تک لکھتے رہے اور جو اُن کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت میں اُن کے قریبی ساتھی مسعود مفتی نے اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۸۶ء میں انہوں نے اسلام آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

# کراچی کی طوطا کہانی

(قدرت اللہ شہاب)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو قدرت اللہ شہاب کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔

۲۔ اُردو ادب میں سوانح عمری کی اہمیت بتانا۔

۳۔ طلبہ کو نوزائیدہ مملکتِ خداداد پاکستان کی مشکلات سے آگاہ کرنا۔

**مشکل الفاظ:** انضباطی ، زودرنجی ، کج کلاہی ، حفظِ ماتقدم ، شُدبُد ، تِلملاہٹ

اگست کے شروع میں کٹک سے کراچی پہنچنے کے سارے رستے مسدُود ہو چکے تھے۔ جُوں تُوں کر کے مَیں کسی نہ کسی طرح بنگال ناگ پور ریلوے کے ذریعے ۱۲ ستمبر کو بمبئی پہنچ گیا اور اگلے روز ایئر انڈیا کے ہوائی جہاز سے کراچی آ گیا۔

جب انڈیا کا وائی کاؤنٹ جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر لینڈ ہوا تو میرا خیال تھا کہ ہم سب مسافر ارضِ پاک پر سر کے بل اُتریں گے اور اترتے ہی اپنی جان اور ایمان سلامت لے آنے پر باجماعت سجدۂ شکرانہ ادا کریں گے، لیکن جہاز سے نکلتے ہی ہمیں نفسانفسی کے آسیب نے دبوچ لیا اور ہم ایک دوسرے سے ٹکراتے، ایک دوسرے کو پچھاڑتے، ایک دوسرے سے دھکم دھکا ہوتے اپنے اپنے سامان کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ سامان وصول کر کے ہم اسے سینے سے لگا کر بیٹھ گئے اور آج تک اسی سامان کر بڑھانے، سجانے، چمکانے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ جو سجدۂ شکرانہ کراچی ایئر پورٹ پر قضا ہو گیا تھا، سامان کے جھمیلے میں وہ اب تک واجب الادا چلا آ رہا ہے.....

''کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!''

وزارتِ تجارت، صنعت اور ورکس، چیف کورٹ بلڈنگ میں واقع تھی۔ مسٹر آئی۔ آئی۔ چندریگر وزیر، مسٹر

میک فارقر سیکرٹری اور مسٹر شجاعت علی حسنی جائنٹ سیکرٹری تھے ۔ انڈر سیکرٹری کے طور پر مجھے امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا چارج دیا گیا ۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ تجارت کسے کہتے ہیں اور برآمدات اور درآمدات کس چڑیا کا نام ہے۔ بندر روڈ پر ایک کباڑیے کی دکان سے مَیں نے ایک انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری اور ایک سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔

کام کرنے کے لیے مجھے ایک چھوٹا سا کیبن ملا ہوا تھا۔ پہلے روز اُس میں فقط ایک میز تھی ۔ دوسرے روز ایک کرسی بھی مل گئی۔ چند روز بعد ایک دو کرسیاں اور بھی آ گئیں ۔ فائلوں کے لیے کاغذ، پن، ٹیگ کبھی دفتر سے مل جاتے تھے،کبھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ اُس روز میں یہ اشیاء بازار سے خود خرید لاتا تھا۔

اُن دنوں پاکستان میں اچانک چینی اور کوئلے کی شدید قلّت پیدا ہوگئی ۔چینی کی جگہ تو خیر لوگوں نے گڑ کا استعمال شروع کر دیا اور کراچی میں جا بجا طرح طرح کا گُڑ ریڑھیوں پر بکنے لگا ،لیکن کوئلے کی کمی بڑی باعثِ تشویش تھی ۔ اُس وقت ہماری سب ریل گاڑیاں کوئلے سے چلتی تھیں اور اس کی قلّت سے رسل و رسائل کے سارے نظام کے معطل ہو جانے کا شدید خدشہ تھا۔ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے چندریگر صاحب نے متعلقہ وزارتوں کے افسروں کی ایک ہنگامی میٹنگ منعقد کی ۔ میں سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس اور انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا ،اس لیے میری چند تجاویز بڑی سہولت سے منظور ہوگئیں۔اس سے میرے وزیر، سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کو غالبًا یہ خوش فہمی ہوگئی کہ مجھے بین الاقوامی تجارت کے معاملات پر کوئی خاص عبور حاصل ہے،معاشیات اور فن اعداد و شمار پر کئی کتابیں خرید کر چند روز میں پڑھ ڈالیں اور محکمانہ میٹنگوں میں زبانی کلامی حد تک دخل در معقولات دینے کی شُد بُد حاصل کر لی۔

ایک روز کامرس سیکرٹری مسٹر میک فارقر نے امپورٹ ایکسپوٹ سیکشن کی ایک فائل طلب کی ۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی،لیکن فائل ملنی تھی نہ ملی۔ میرے سیکشن کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ نے چھان بین کے بعد سارا الزام اپنے ایک اسسٹنٹ کے سر تھوپ دیا کہ مطلوبہ فائل اس کی لاپروائی سے گُم ہوگئی ہے۔ساتھ ہی انھوں نے اپنے نوٹ میں یہ بھی لکھا کہ یہ اسسٹنٹ لااُبالی قسم کا منہ زور اور منہ پھٹ قسم کا انسان ہے۔دفتری دستور العمل کی چنداں پابندی نہیں کرتا۔اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف سخت انضباطی اور تادیبی کارروائی کر کے قرارواقعی سزا ضرور دینی چاہیے۔

میں نے ''ملزم'' کو اپنے کمرے میں طلب کیا، تو ایک خوش پوش، بانکا ترچھا، گوراچٹا چھریرے بدن کا جوان لٹکتا مٹکتا بے اعتنائی سے آیا اور دونوں کُہنیاں میز پر ٹیک کر سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ خود میری جواب طلبی کرنے والا ہو۔ مَیں نے اُس سے فائل کے متعلق دریافت کیا' تو اُس نے بے حد رُکھائی سے بے حد مختصر جواب دیا ''مل نہیں رہی۔''

''کیوں نہیں مل رہی؟'' مَیں نے بھی لہجے میں تیزی پیدا کر کے کہا۔

''گُم ہوگئی۔'' اسسٹنٹ نے وضاحت کی۔

''کیسے گُم ہوگئی؟'' مَیں نے اور بھی تیزی سے پوچھا۔

''بس جی گُم ہوگئی، بتا کے تو نہیں گئی۔'' اسسٹنٹ نے اپنے بائیں ہاتھ کی پُشت ناک پر رگڑ کر ''کھوں کھوں'' کیا اور جس طرح لٹکتا مٹکتا کمرے میں داخل ہوا تھا، اسی طرح لٹکتا مٹکتا واپس چلا گیا۔

یہ ٹکا سا جواب سُن کو مَیں کچھ دیر کے لیے سنّاٹے میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے سوال کی حماقت اور اسسٹنٹ کے جواب کی بے ساختہ معقولیت پر ہنسی آنے لگی۔ اگر ہر لاپتہ چیز یہ اعلان کر کے جائے کہ وہ کیسے گُم ہو رہی ہے تو گمشدگی کے واقعات ہی کیوں رونما ہوں؟

وہ دن اور آج کا دن، جمیل الدین عالؔی سے میرے تعلقات کچھ اسی نوعیت کے خطوط پر استوار چلے آ رہے ہیں، کیونکہ امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا الھڑ، بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گُم کر بیٹھا تھا، جمیل الدین عالؔی ہی تھا۔ مَیں اس واقعہ کو اپنی زندگی کا بڑا قیمتی اور خوشگوار حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے عالؔی کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا، جس کے خوبصورت دوہوں اور ملیؔ نغموں نے مجھے شادکام کیا ہے۔ جس کے خلوص کی دولت نے مجھے مالا مال کیا ہے اور جس کی نازک مزاجی، زُود رنجی، تلملاہٹ، جُھنجلاہٹ اور کج کلاہی نے میرے دل میں کبھی کوئی آزُردگی پیدا نہیں کی۔

وزارتِ تجارت میں کام کرتے ہوئے مجھے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا، کہ جمّوں و کشمیر میں آزادی کی لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ ہری سنگھ کی قیادت میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ ماں جی اور دوسرے عزیز جمّوں سے جان بچا کر سیالکوٹ اُٹھ آئے۔ اب مجھے کراچی میں مکان کی فوری ضرورت پڑ گئی تا کہ انہیں اپنے پاس لے آؤں۔ ہماری منسٹری میں ایک صاحب ورکس ڈویژن کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ سرکاری ملازمین کو مکان

دینے کے سلسلے میں وہ مختارِ کُل تھے۔ میرے کئی جاننے والوں کو وہ بڑی شفقت اور عنایت سے مکان الاٹ بھی کر چکے تھے۔ میں نے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی ضرورت بیان کی تو انہوں نے بڑی رُکھائی سے ٹکا سا جواب دے دیا۔ میَں نے چند افسروں کے نام گنوائے جنہیں وہ حال ہی میں مکان فراہم کر چکے تھے، تو انہوں نے لاتعلقی سے انگریزوں کی طرح اپنے شانے اچکائے اور پھر عینک لگا کر فائلیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کے بعد مجھے جواہر لال نہرو روڈ پر (جو اب قائداعظمؒ کے مزار کے سامنے ہے) ایک مکان کا نچلا حصہ کرائے پر مل گیا۔ اوپر والی منزل میں ہندو مالک مکان خود رہتا تھا۔ اُس نے اپنا خاندان اور مال واسباب تو بھارت بھیج دیا تھا اور اب مکان اور دکان کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے کے انتظار میں یہاں رُکا ہوا تھا۔ ساٹھ ستّر کا یہ بُڈھا بڑا سخت گیر مالک مکان ثابت ہوا۔ ایک تو اُس نے تین چار کمروں کا کرایہ ایسا گس کے لگایا کہ اس میں میری آدھی تنخواہ صاف نکل جاتی تھی۔ دوسرے وہ بجلی اور پانی کے استعمال پر نہایت کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ آدھی رات کو بھی ضرورتاً کسی کمرے کی بجلی جلائی جائے تو سوئے ہوئے مالک مکان کی چھٹی حِس فوراً بیدار ہو جاتی تھی اور وہ واویلا مچانا شروع کر دیتا تھا کہ ''بتی بند کرو، بتی بند کرو۔ بجلی مفت نہیں ملتی کہ ساری ساری رات جلا کر عیش کیا جائے۔'' ایک روز مالک مکان کہیں سے گھوم کر واپس گھر آیا، تو ماں جی برآمدے میں بیٹھی اپنے بال سُکھا رہی تھیں۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ان کو بے نقط سنانی شروع کر دیں کہ میَں تو نلکا بند کر کے گیا تھا، میری غیر حاضری میں پانی کھول کر نہائی کیوں ہو؟ ماں جی نے ہزار سمجھایا کہ انہوں نے نلکا نہیں کھولا بلکہ صبح سے اپنے لیے پانی کی بالٹی بھر کر رکھی ہوئی تھی، لیکن اس شریف آدمی کو بالکل یقین نہ آیا اور اس نے مسلمانوں کے جھوٹ، فریب اور مکر پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا۔

انہی دنوں کراچی میں ہلکا سا ہندو مُسلم فساد ہو گیا۔ کچھ سامان بیچ باچ کر ہمارے مالک مکان نے ڈھائی لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہوا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے مکان پر حملہ کیا تو نقدی بھی لُٹ جائے گی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ یہ پونجی ماں جی کے پاس امانت رکھنے کے لیے آیا۔ وہ روپے گِن کر دینا چاہتا تھا، لیکن ماں جی کو دس کے بعد گنتی ہی نہ آتی تھی۔ اس لیے مجھے سامنے بٹھا کر اُس نے ڈھائی لاکھ روپیہ دوبارہ گِنا اور اُسے ایک چمڑے کی تھیلی میں تالا لگا کر ماں جی کے حوالے کر دیا۔ مجھ سے اس کی رسید لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

ماں جی نے اس امانت کی بڑی رکھوالی کی ۔رات کو وہ اس تھیلی کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں۔ نماز کے لیے بھی وہ اسے اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر بیٹھتی تھیں۔ دو تین روز میں امن و امان قائم ہوگیا۔ بڈھے مالک مکان نے مجھے پھر سامنے بٹھا کر ڈھائی لاکھ روپیہ دوبارہ گِنا۔ رسید مجھے لوٹائی اور اپنی امانت بغل میں دبا کر اوپر والی منزل میں واپس چلا گیا۔

مالک مکان نے ایک طوطا بھی پال رکھا تھا، جسے اُس نے سندھی زبان میں چند گالیاں بڑے شوق سے سکھا رکھی تھیں۔ باہر جاتے وقت وہ طوطے کا پنجرہ ماں جی کی رکھوالی میں دے جاتا تھا۔ جب کوئی گھر والا طوطے کے سامنے سے گزرتا تھا ،تو وہ بڑی بے تکلفی سے اسے اپنی مخصوص گالیاں سنا دیتا تھا۔ اپنے کام کاج سے فارغ ہوکر جب بڈھا گھر واپس لوٹتا تھا، تو ماں جی اکثر اسے چائے یا شربت بنا دیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ طوطے کا پنجرہ لے کر اوپر چلا جاتا، اور تازہ دم ہوکر پھر ہمیں بجلی اور پانی سے محروم کرنے کے عمل میں مصروف ہوجاتا تھا۔

ایک روز چندریگر صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ انہوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میَں اُن کے دفتر میں پڑی ہوئی سب فائلیں لے کر اُن کے گھر آجاؤں۔ مجھے اُن کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ جب میَں نے اُن سے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ بڑی حیرت سے بولے'' تعجب ہے تمہیں اپنے منسٹر کا گھر تک معلوم نہیں؟''

میں اس بات کا کیا جواب دیتا؟ مجھے اپنے یا دوسرے وزیروں کے گھر اس وقت معلوم تھے، نہ کبھی بعد میں معلوم کرنے کا شوق چرایا ہے۔

چندریگر صاحب کے دفتر میں تیس چالیس فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ میَں نے انہیں سمیٹ کر گھوڑا گاڑی میں ڈالا اور وزیر صاحب کے بنگلے کی راہ لی ۔کوٹھی پر پولیس کا پہرہ تھا۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اندر جانے سے روک دیا کیونکہ وزیروں کی کوٹھیوں کے اندر صرف موٹر کاروں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

چندریگر صاحب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس سردار عبدالرب نشتر بھی تشریف فرما تھے۔

'' آپ سٹاف کار میں کیوں نہیں آئے؟'' چندریگر صاحب نے پوچھا۔

'' سٹاف کار فارغ نہ تھی۔'' میَں نے جواب دیا۔

چندریگر صاحب نے یکے بعد دیگرے دو تین افسروں کے نام لیے اور بولے'' ہاں اُن میں سے کسی کے بچّوں کو کلفٹن کی سیر کرانے گئی ہوگی۔''

کسی وجہ سے چندریگر صاحب مجھے مسٹر سوہاب کہا کرتے تھے۔ انہوں نے نشتر صاحب سے میرا تعارف یوں کرایا ''یہ میرے انڈر سیکرٹری مسٹر سوہاب ہیں، جو اپنے وزیر کا گھر تک نہیں جانتے۔''

''سحاب آپ کا تخلص ہے؟'' نشتر صاحب نے دلچسپی کے انداز میں پوچھا۔

میں نے انہیں اپنا پورا نام بتایا، تو نشتر صاحب پیشانی سکیڑ کو کچھ سوچ میں پڑ گئے اور بولے ''کیا ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں؟ مجھے اس نام سے کسی قدر شناسائی کی بُو آتی ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے مجھے اُن کی نیازمندی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

نشتر صاحب نے میرے سروس کیریئر کے متعلق پے در پے چند سوال پوچھے۔ جب قحطِ بنگال کی بات آئی تو وہ یکایک چونکے اور فرمایا'' ہاں، ہاں، خوب یاد آیا، ایک بار دہلی میں شہید سہروردی نے آپ کی کچھ مزے کی باتیں سنائی تھیں۔''

چندریگر صاحب کی ہدایت کے مطابق مَیں نے کامرس، ورکس اور انڈسٹریز ڈویژنوں کی فائلیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کر کے رکھ دیں تو نشتر صاحب بھی فارغ ہو کر چلنے کو تیار تھے۔ انہوں نے از راہِ نوازش مجھے اپنی کار میں لفٹ دینے کی پیشکش کی۔

راستے میں ایک مقام پر کچھ ہندو خاندان آٹھ دس اُونٹ گاڑیوں پر اپنا سامان لادے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ نشتر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''یہ لوگ کتنے آرام سے اپنا تنکا تنکا سمیٹ کر یہاں سے لے جا رہے ہیں ۔ اُس طرف سے ہمارے لوگ جس حالت میں یہاں پہنچتے ہیں' اُس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

نشتر صاحب کی تفننِ طبع کے لیے مَیں نے انہیں اپنے ہندو لینڈ لارڈ کے کچھ لطیفے سنائے تو وہ حیرت سے بولے'' آپ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں؟ لینڈ لارڈ کیا کرایہ وصول کرتا ہے؟''

'' تقریباً آدھی تنخواہ۔'' میں نے بتایا۔

'' سرکاری مکان کیوں نہیں ملا؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے خلیلی صاحب کی مجبوریاں اور معذوریاں بیان کیں تو وہ خاموش ہو گئے۔ دو تین روز کے بعد نشتر صاحب کا پی۔ اے میرے دفتر آیا اور لارنس روڈ پر نوشیروان جی مہتہ بلاک کے ایک فلیٹ کا الاٹمنٹ آرڈر میرے

حوالے کر گیا۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ فلیٹ انہوں نے میرے لیے کس طرح حاصل کیا، لیکن اُس وقت اس گھر کا ملنا میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اُس جہان میں بھی خوش رکھے۔

لارنس روڈ والے فلیٹ میں دو بڑے بیڈروم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بسا اوقات اس میں ہم تیس تیس پینتیس پینتیس لوگ گزارہ کرتے تھے۔ بہت سے عزیز واقارب اور دوست احباب بھارت اور کشمیر سے جان بچا کر ہمارے پاس پہنچ رہے تھے۔ سب کے سب انتہائی خستہ حالی اور درماندگی کا شکار تھے۔ کوئی پاپیادہ قافلوں کے ساتھ مہینوں کے سفر کے بعد پاکستان پہنچا تھا۔ کوئی اُن گاڑیوں پر سوار تھا جنہیں جابجا روک کر لوٹا مارا جاتا تھا۔ کوئی طویل عرصے تک مہاجر کیمپوں کی دلدل میں دھنسا رہا تھا۔ کسی کو کپڑوں کی حاجت تھی، کسی کو علاج معالجے کی ضرورت تھی اور زندگی کے ساتھ ازسرِ نو ناطہ جوڑنے کے لیے سب ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ ایک روز میں نے اپنا بٹوہ کھولا، تو اُس میں فقط سولہ روپے موجود تھے۔ مجھے بڑی تشویش لاحق ہوئی، کیونکہ ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا اور اگلی تنخواہ میں آٹھ دس روز باقی تھے۔

اُس زمانے میں میرے پاس کوئی بینک بیلنس نہ تھا، بلکہ اُس وقت تک مَیں نے سرے سے کوئی بینک اکاؤنٹ ہی نہ کھولا تھا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں میرا قاعدہ تھا کہ میں پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ نقد وصول کرتا۔ کچھ پیسے ماں جی کو جموں بھیج دیتا تھا اور باقی رقم مہینے کے آخر تک ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اب جو مَیں نے دیکھا کہ گھر میں دو ڈھائی درجن مہمان اور بٹوے میں صرف سولہ روپے موجود ہیں، تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میرا واحد اثاثہ اورنٹیل لائف انشورنس کمپنی کی ایک انشورنس پالیسی تھی، جو چند سال قبل میں نے بھاگلپور میں خریدی تھی۔ میں اپنی پالیسی لے کر کراچی اورنٹیل انشورنس کمپنی کے دفتر گیا اور منیجر سے کہا کہ واجب الادا رقم وصول کر کے میں بیمہ کی پالیسی سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔ منیجر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ بیمہ پالیسی سنبھال کر اپنے پاس رکھوں اور اس سے دست برداری کا خیال دل سے نکال دوں۔

میں نے منیجر کی کاروباری فراست کی تعریف کی، لیکن دست برداری کے ارادہ پر مستقل مزاجی سے اڑا رہا۔ کچھ مزید ردوکد کے بعد منیجر نے حساب جوڑا، اور پالیسی واپس لے کر مجھے تین ہزار سات سو روپے ادا کر دیئے۔

یہ گراں قدر رقم ہاتھ میں آتے ہی تہی دستی کے لمحات کی یاد کافور کی طرح اڑ گئی اور میرا دماغ ازسرِ نو آسمان

سے باتیں کرنے لگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی سستی سی سیکنڈ ہینڈ موٹر کار مل جائے تو بڑا آرام نصیب ہو۔ اُڑیسہ میں میرے پاس بڑی سمارٹ اور بانکی سپورٹ کار تھی۔ کٹک سے روانگی کے وقت سب نے یہی زور دیا کہ مَیں اسے فروخت کر دوں کیونکہ فسادات کی وجہ سے اس کا ریل کے ذریعہ پاکستان پہنچنا امرِ محال تھا' لیکن اس کار کے ساتھ کچھ ایسی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں کہ اسے بیچنے پر دل رضا مند نہ ہوا اور مَیں نے اسے ریل کی ایک بوگی میں مقفل کر کے اللہ توکل کراچی کے لیے بک کروا دیا۔ یہ بوگی کسی نہ کسی طرح جالندھر تک تو ضرور پہنچی، لیکن وہاں پر کسی صاحبِ ذوق کی نظرِ انتخاب اس پر پڑ گئی اور اُس نے کار کو ریل گاڑی سے اُتار لیا۔ اب کراچی میں پیدل جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے طبیعت اُکتانے لگی تھی۔ جب انشورنس پالیسی کے پیسے جیب میں آ گئے تو دبی دبی اکتاہٹ کا یہ احساس آناً فاناً شدید تکان اور ماندگی میں تبدیل ہو گیا اور کار خریدنے کی خواہش نے دل کو بُری طرح اپنے شکنجے میں کس لیا۔

اب کار کے خریدار کی حیثیت سے مَیں نے کراچی پر نگاہ ڈالی' تو سڑک پر چلنے والی ہر دوسری یا تیسری کار بکنے کے لیے تیار تھی، کیونکہ بمبئی جانے والے بہت سے ہندو ہوائی جہاز یا سمندری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آخری چیز اپنی کار فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی خوش پوشاک، چرب زبان ہندو نوجوان مسٹر وڈوانی سے میری ملاقات سرِ راہ ہو گئی۔ اُس کے پاس پندرہ بیس سال پُرانی شیورلٹ کار تھی، جسے وہ شام کے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی عُجلت میں تھا۔ اُس نے اپنی کار کی مدح میں رُطبُ اللسان ہو کر ایسے ایسے گیت گائے اور سالہا سال سے اُس کی بے عیب خدمت گزاری اور بے لوث وفاداری کے اتنے قصّے سنائے کہ مجھے ایک گونہ افسوس ہونے لگا کہ یہ شخص اپنی اس قدر محبوب اور کار آمد شے کو بہ امر مجبوری پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ مَیں نے مسٹر وڈوانی سے قیمت کے متعلق استفسار کیا، تو اُس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں سے لگا کر بڑا توبہ تلّہ کیا، اور قسم کھائی کہ وہ اپنی محبوب کار کی قیمت لگانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کی نظر میں یہ کار بالکل انمول تھی اور وہ پیسہ کمانے کے لیے اسے نہیں بیچنا چاہتا تھا، وہ تو بس ایک ایسے قدر دان کی تلاش میں تھا' جسے سپرد کر کے اسے یہ اطمینان ہو کہ اس کی چہیتی موٹر کار واقعی صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کسی وجہ سے اُسے میرے چہرے پر قدر دانی کی مہر ثبت نظر آئی، اور مَیں بھی اُس کی چرب زبانی کی چکناہٹ پر ایسا پھسلا کہ پانچ ہزار سے شروع کر کے ڈھائی ہزار روپے پر سودا طے کر لیا۔ مسٹر وڈوانی نے مجھے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا، اور قدم قدم پر اُس کی خوش رفتاری کی

تعریف و توصیف کرتا ہوا مجھے ہمارے گھر لے آیا۔ مَیں نے اسے ڈھائی ہزار روپے نقد ادا کر کے کار کے کاغذات وصول کیے اور وہ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہو کر رخصت ہو گیا۔

مسٹر وڈوانی کے جانے کے بعد مَیں نے کار چلانے کی کوشش کی تو اُس نے سٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اب یہ عُقدہ کھلا کہ انجن سٹارٹ ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دو چار آدمی اسے کافی دُور تک دھکا دیں ۔ انجن چالُو ہوتا تھا تو پہیئے رک جاتے تھے۔ پہیئے حرکت میں آتے تھے تو انجن دم توڑ دیتا تھا۔ گیئر بدلنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، اور بریک کبھی لگتی تھی کبھی صاف مُکر جاتی تھی۔ میل ڈیڑھ میل چلنے کے بعد پانی جوش میں آکر اُبلنے لگتا تھا اور ہارن کی جگہ اُس کے دروازے اور مڈگارڈ بڑے زور سے بجتے تھے۔ کار کی اگلی پچھلی بتیوں میں سے کوئی بھی کام نہ کرتی تھی اور کئی بار اندھیرے میں موٹر چلانے کے لئے ہم لوگ اُس کے سامنے لالٹین جلا کر لٹکایا کرتے تھے۔

انہی دنوں چودھری غلام عباس صاحب شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے۔ کراچی آکر وہ ہمارے ہاں ٹھہرے اور ٹیلی فون پر قائداعظمؒ کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ قائداعظمؒ نے انہیں اگلے روز لنچ پر مدعو کیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر انہیں سواری کی ضرورت ہو تو گورنر جنرل ہاؤس کی کار انہیں لینے وقت پر آجائے گی۔ چودھری صاحب ہمارے ہاں کار کھڑی دیکھ چکے تھے، اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ سواری کا انتظام ہے اور وہ خود ہی حاضر ہو جائینگے۔

سواری کا جو انتظام موجود تھا، اُس کی اصلیت سے ہم نے چودھری صاحب کو آگاہ کیا تو وہ بولے ''کوئی پرواہ نہیں، ہم ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر سے روانہ ہو جائیں گے تا کہ کار کے سارے ناز نخرے اٹھانے کے بعد بھی کافی وقت ہاتھ میں رہے۔''

لنچ کا ٹائم سوا بجے تھا۔ ہم دھکا لگانے والی نفری کار میں بٹھا کر بارہ بجے ہی روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے کار کا موڈ ٹھیک رہا، اور ہم ساڑھے بارہ ہی گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ اے۔ ڈی۔ سی بڑا پریشان ہوا کہ چودھری صاحب اتنی جلدی کیوں آگئے ہیں؟ چودھری صاحب نے اُس کی ڈھارس بندھائی کہ وہ بڑی خوشی سے اے۔ ڈی۔ سی کے کمرے میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کرلیں گے۔

''انتظار کی بات نہیں۔'' اے۔ڈی۔سی نے جواب دیا۔'' قائداعظمؒ کا حکم ہے کہ جب چودھری صاحب

تشریف لائیں، تو وہ خود پورچ میں آ کر کار کے دروازے پر اُن کا استقبال کریں گے۔ اس لیے فی الحال آپ واپس چلے جائیں اور ٹھیک ایک بج کر پندرہ منٹ پر پورچ میں پہنچ جائیں۔''

اس گفتگو کے دوران کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ ہم نے دھکا دے کر اسے اسٹارٹ کیا اور باہر آ کر گیٹ کے قریب ہی گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے رک گئے۔ سکیورٹی والے بڑے مُستعِد تھے۔ وہ فوراً ہماری طرف لپکے اور وہاں رکنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے انہیں اصلی صورت حال سے آگاہ کیا، تو وہ حیران ہوئے کہ قائداعظمؒ کا معزز مہمان ایسی پھٹیچر کار پر سوار ہو کر گورنر جنرل ہاؤس آیا ہے۔ سکیورٹی سٹاف کے کچھ لوگوں نے آ آ کر چودھری صاحب کے ساتھ عقیدتاً ہاتھ بھی ملائے۔

گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ اس وقفہ انتظار کے دوران چودھری غلام عباس نے کہا کہ ریاست جموں و کشمیر کا جو علاقہ آزاد ہو چکا ہے، وہاں پر نظم و نسق قائم کرنے کے لئے وہ میری خدمات حکومت پاکستان سے مُستعار مانگنا چاہتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟ چودھری صاحب نے دراصل میرے منہ کی بات چھین لی، کیونکہ مَیں خود اُن سے یہی درخواست کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ مَیں نے انہیں یقین دلایا کہ مَیں جتنی جلد آزاد کشمیر جا سکوں، اسی قدر اُسے اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھوں گا۔

وقت ہو چکا تھا۔ سکیورٹی کے کچھ سپاہیوں نے بڑی خوشدلی سے کار کو دھکا لگایا اور ہم بڑے زور شور سے پھٹ پھٹ کرتے ٹھیک سوا بجے گورنر جنرل ہاؤس کی پورچ میں جا رُکے۔ عین اُسی لمحے قائداعظمؒ بھی اندر سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے چودھری صاحب کے ساتھ معانقہ کیا اور انہیں بازو سے تھام کو اندر لے گئے۔

ہم نے احتیاطاً کار کا انجن چالو رکھا تھا۔ اس کے شور شرابے میں قائداعظمؒ کا صرف ایک فقرہ سنائی دیا۔

"Ghulam Abbas I am really happy, You are here!"

(ماخوذ از شہاب نامہ)

**مختصر تعارف**

**چودھری غلام عباس :** تحریکِ آزادی کے راہ نما۔ اِن کی ریاست جموں و کشمیر کی آزادی اور ریاست پاکستان کے ساتھ الحاق کی جدو جہد اور قربانیاں جہاد سے کم نہیں ہیں۔

**ابراہیم اسمٰعیل چندریگر (آئی آئی چندریگر) :** آل انڈیا مسلم لیگ کے اہم ''رکن'' قائداعظمؒ کے دستِ راست' آزادی کے بعد پاکستان کی مرکزی کابینہ میں وزیر رہے' صوبہ سرحد اور پھر پنجاب کے گورنر اور دسمبر ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے وزیراعظم بنے۔

**قدرت اللہ شہاب :** سابق ریاست جموں و کشمیر کے پہلے آئی سی ایس (انڈین سول سروس)، اُردو ادیب، گورنر جنرل کے سیکرٹری اور بعد ازاں صدر ایوب خان کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

**جمیل الدین عالؔی :** ممتاز صحافی، ادیب اور شاعر۔ ۱۹۴۸ء میں وزارتِ تجارت میں ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں نیشنل بنک آف پاکستان سے وابستہ ہو گئے، بطور پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ ایڈوائزر، پاکستان بنکنگ کونسل سے ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

## مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

(الف) مصنف کو ارضِ پاک پر کس انداز سے اُترنے کی توقع تھی؟

(ب) امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کے معاملات سمجھنے کے لیے مصنف نے کیا کیا؟

(ج) قائداعظمؒ کے اے ڈی سی نے چودھری غلام عباس کو اپنے کمرے میں کیوں نہ بیٹھنے دیا؟

(د) مصنف کے ہندو مالک مکان نے اپنے طوطے کو کیا سکھا رکھا تھا؟

(ہ) ہندو مالک مکان نے اپنی رقم ماں جی کے پاس کیوں امانت رکھی؟

۲۔ سبق کے حوالے سے دُرست لفظ لکھ کر جملے مکمل کریں:

(الف) قائداعظمؒ نے چودھری غلام عباس کے ساتھ..................۔

(ہاتھ ملایا ، معانقہ کیا)

(ب) منیجر نے پالیسی واپس لے کر مجھے................ادا کر دیے۔

(دو ہزار سات سو روپے ، تین ہزار سات سو روپے)

(ج) مالک مکان نے طوطے کو..................میں گالیاں سکھا رکھی تھیں۔

(ہندی زبان میں ، سندھی زبان میں)

(د) الھڑ، بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گم کر بیٹھا تھا وہ..................تھا۔

(مشتاق یوسفی ، جمیل الدین عالؔی)

(ہ) اُن دنوں پاکستان میں اچانک................کی شدید قلّت پیدا ہو گئی۔

(چینی اور کوئلے ، پیٹرول اور ڈیزل)

(ز) ہندو مالک مکان، مکان اور دکان..................کرنے کے لیے رُکا ہوا تھا۔

(صاف ، فروخت)

(ح) ایک دن میں نے..................کھولا تو اُس میں صرف سولہ روپے تھے۔

(صندوق ، بٹوہ)

(ط) مصنف کی گاڑی بوگی میں سے..................میں اُتار لی گئی۔

(جالندھر ، بٹھنڈہ)

۳۔ درج ذیل الفاظ/محاورات کے معنی لکھ کر جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

دخل در معقولات ، شُد بُد ، کلیجہ منہ کو آنا ، ٹکا سا جواب دینا ، خمیازہ بُھگتنا ، ہاتھوں کے طوطے اُڑ جانا

رسی جل گئی مگر بل نہ گیا ، جوئے شیر لانا ، مُوشگافیاں

۴۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

زود رنجی نعمت غیر مترقبہ استغفراللہ سبحان اللہ حفظ ماتقدم

سابقہ/لاحقہ کسی لفظ سے پہلے جب کوئی حرف یا لفظ لگا کر نیا لفظ بنایا جاتا ہے تو پہلے لگنے والا حرف سابقہ کہلاتا ہے۔
مثلاً پڑھ سے پہلے اَن لگا کر نیا لفظ ان پڑھ بنایا جاتا ہے "ان" سابقہ ہے۔
اسی طرح جب کسی لفظ کے بعد کوئی حرف یا لفظ لگا کر لفظ بنایا جائے تو بعد میں لگنے والا حرف لاحقہ کہلاتا ہے۔
مثلاً مسلم کے بعد آباد لگانے سے مسلم آباد۔ "آباد" لاحقہ ہے

۵۔ درج ذیل سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ الفاظ لگا کر کم از کم پانچ پانچ نئے الفاظ بنائیں۔

جواں ، خوش ، خواہ ، افزاء ، گیر

۶۔ درج ذیل بیانات کی نشاندہی درست (✓) اور غلط (X) کے نشانات لگا کر کریں۔

(الف) اُن دنوں پاکستان میں چینی اور پتّی کی قلت پیدا ہو گئی۔

(ب) قائداعظم محمد علی جناحؒ وقت کے بہت پابند تھے۔

(ج) قدرت اللہ شہاب خوشامد پسند تھے۔

(د) چودھری غلام عباس شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے۔

(ہ) مصنف نے شیورلیٹ کار تین ہزار میں خریدی۔

(و) مصنف ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو بھارت سے پاکستان پہنچے۔

۷۔ چودھری غلام عباس کی کراچی آمد اور قائداعظمؒ سے ملاقات کا حال اپنے الفاظ میں لکھیں۔

## سرگرمی

سبق سے پانچ مرکب اضافی تلاش کر کے لکھیں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو سوانح عمری یا خودنوشت لکھنے کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو زبان میں لکھی گئی دیگر سوانح عمریوں سے بھی متعارف کرائیں۔

۳۔ قدرت اللہ شہاب کے نثری اسلوب سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

# سجاد حیدر یلدرم

سجاد حیدر یلدرم ۱۸۸۰ء میں ایک معزز سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد پولیس کے محکمہ میں انسپکٹر تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی' پھر میٹرک بنارس کے ایک سکول سے پاس کیا۔ ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ طالب علمی ہی کے دور سے ایک مضمون نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار بنے۔ پھر برطانوی حکومت ہند کے پولیٹیکل ایجنٹ رہے۔ کچھ عرصہ بعد سفارت خانہ میں ایک ڈپلومیٹ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ڈپٹی کلکٹر رہے۔ کالا پانی میں برطانیہ کی طرف سے کمشنر رہے۔

وہ اردو، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ اردو نثر میں اس خاص طرز تحریر کے بانی تھے۔ جسے ''ادب لطیف'' کہا گیا ہے۔ یلدرم کی عبارت ایک خاص بے باکانہ انداز لئے ہوئے ہے۔ ان کی لفظی بندشیں بہت خوبصورت اور شگفتہ ہوتی ہیں۔ فارسی تراکیب کا استعمال ضرورت سے زیادہ کرتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں موسیقی کی کیفیت ہوتی ہے۔ جس سے تحریر میں دلکشی اور لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے کردار جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ تخیلی دنیا کے انسان ہیں۔ جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ یلدرم نے ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

# مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

(سجاد حیدر یلدرم)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو وقت کی اہمیت اور درست استعمال سے آگاہ کریں۔
۲۔ طلبہ کو دوستوں کے بے مقصد اور بیجا مطالبات کرنے کے منفی اثرات سے آگاہ کریں۔
۳۔ طلبہ کو اُردو ادب میں مضمون نگاری کی اہمیت سے روشناس کرائیں۔

**مشکل الفاظ:** احسان فراموش ، اسپیچ ، بادل نخواستہ ، بھڑبھڑایا ، بشاشت ، تخلیہ

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن دلی کے چاندنی چوک میں گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی۔ جو بڑے موثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرایہ میں دہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز مجھے کچھ ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا، جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت ہوتا۔ مگر بد معاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو میں ایسا شقی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہئے، یہ تھی۔

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لئے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں، اب روٹیوں کو محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا، میں چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خدا کے بندو! میری سنو، میں غریب الوطن ہوں"۔

فقیر تو کہتا ہوا اور جن پر اس قصے کا اثر ہوا ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات

پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں، میں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں، آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہئے۔ میں رات دن فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابل رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں اس بظاہر عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے۔ وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ ''میرا کوئی دوست نہیں''۔ میں حسرت سے کہتا ہوں۔ ''میرے اتنے دوست ہیں۔ اس کا کوئی دوست نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اسے مبارک باد دینی چاہئے''۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص یہیں تو مجھ سے بڑھ گیا لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جارہا ہوں، مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کرسکوں اور انہیں اطمینان سے قلم بند کرسکوں یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اسے سوچ سکوں؟ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اتنا روپیہ لے جاسکتا ہے اور اس کا کوئی دوست راستہ میں ملے گا اور یہ نہ کہے گا!

''بھائی جان! دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ تھوڑا سا روپیہ قرض دو''۔ کیا اس کے احباب، وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آرہے ہوں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصے اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا ہے؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں، جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف ونزار ہوں۔ یا اللہ کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کون سی نعمت چاہتا ہو؟ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بے ہودہ خیالات ہیں بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوجاتی ہے اور

یہ ان سے بھاگتا ہے مگر میں دوستوں کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں۔ اور میرے خیر طلب ہیں۔ مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں۔ جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا جب آئیں گے، شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے، غرض کہ ان کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔

''کوئی آ رہا ہے قیامت نہیں ہے''

ان کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ ''میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں''۔ تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) ''خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟'' ''بڑی دیر سے''۔ توبہ توبہ۔ اچھا بس میں، ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا، مجھے خود جانا ہے چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھا تھا''۔ یہ کہتے ہی وہ اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا (آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

''اہاہاہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا، مگر دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے تو اب جاتا ہوں۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ خدا حافظ''۔ یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دباتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔

اور لیجئے، دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انہیں کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لئے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش

کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں۔ ''ہاں بڑا خراب موسم ہے، میرے چھوٹے بچے کو بخار آ گیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے'' اگر پالیٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے ہیں کہ طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟ کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں۔ جنہیں اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جب کہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ من جملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے، میں محمد شاکر خان صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر خان صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر کے نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا، امرا کے شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے یہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہہ کے۔

''شہر میں رات دن شور وشغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو میری خوشی کرو''۔

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مختصر سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر میں ان کے ساتھ ہولیا۔ ''ایڈیٹر معارف'' سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصہ میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر، میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتہ کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے کو جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ ''ہیں'' ''ہیں'' کہیں ایسا غضب نہ کرنا آج ہی سے کام شروع

کردو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کرتے ہیں۔ دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معدوم۔ خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے مگر مجھے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جس یکسوئی کی تلاش میں سرگرداں تھا وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا، جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد، جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب کی تہہ میں مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا مگر اکثر میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں ضرورت کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی، مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی اور میرے خیالات کو نہایت تیزی کے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ تن، تن، تتن، تن تنانا تا، چھن، تاتن، تن تن تن، میں ایسا مصروف کہ دنیا اور مافیہا کی خبر نہ تھی کہ یکا یک اس تن تن نے چونکا دیا۔ ''ہیں یہ کیا ہے؟'' افوہ! اب میں سمجھا میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرمارہے ہیں بہت خوب بجارہے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہوگئی تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)۔

''کون ہے؟''۔

''میں ہوں شُبن! سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں''۔

بادل نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر خاں صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یک سو ہو کر لکھنا

شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا۔ اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سر نو بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ بہ ہزار دقّت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

دروازہ پر پھر دستک۔

''کیا ہے؟''۔

''اچھا''۔

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

''ہاں''

''حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے''۔

''اُفوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں میں پھر کھالوں گا اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں''۔

دستک

''کیا ہے؟''

''سرکار کہتے ہیں اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے مگر کھانا ٹھنڈا ہو کر بالکل خراب ہو جائے گا''۔

''اچھا بھائی لو ابھی آیا''۔

یہ کہہ کے میں کھانے کے لئے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں، میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں۔

''چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟''۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک!

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔ سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ فوراً نیچے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب کہتے ہیں یہ ہوتا ہے۔

”آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے“۔ میں سچی بات کہوں کہ کچھ بھی نہیں لکھا تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ آخر اس قدر کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں
مجھے یقین ہوا، مجھ کو اعتبار آیا

دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا۔ مگر مجبور ہوں اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

ایک صاحب ہیں جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں ”میاں! عرصے سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں مگر اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں۔

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

(خیالستان)

## مشق

ا۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

(الف) مصنف کو چاندنی چوک پر کیوں ٹھہرنا پڑا؟

(ب) مصنف نے فقیر کو خود سے کیوں اچھا پایا؟

(ج) فقیر کی صدا اپنے الفاظ میں لکھیں۔

(د) مصنف اپنے دوستوں سے کیوں کر تنگ تھا؟

(ہ) شاکر صاحب کی کوٹھی میں مصنف کے لئے کمرہ کس طرح آراستہ کیا گیا تھا؟

(و) فقیر کے خدوخال اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۲۔ درج ذیل عبارت کی بحوالہ متن تشریح کریں۔

بادل نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر خاں صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یک سو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شُبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا۔ اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ ازسرنو بنانا پڑا۔ طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔

۳۔ درج ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کے مفہوم واضح ہو جائیں۔

شقی القلب، غریب الوطن، رشک، بشاشت، نحیف ونزار

بھونچال، بادل نخواستہ، اچاٹ ہونا، کسر نفسی، معدوم

۴۔ ”حروف جار“ ایسے حروف جو ایک اسم کو دوسرے اسم یا فعل سے ملا رہے ہوں اُنھیں حروف جار کہتے ہیں۔ مثلاً میں، سے، پر، کو، درمیان وغیرہ۔ آپ اس سبق میں سے پانچ ایسے جملے تلاش کیجئے جن میں حروف جار استعمال ہوئے ہیں۔

۵۔ درج ذیل الفاظ کے مترادف الفاظ لکھیں۔

صدا، آفت، جاہل، حسرت، خلقت

۶۔ درج ذیل الفاظ میں واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیں۔

اُمور، اثر، فقیر، قلب، مصیبت

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو اُردو زبان میں لکھنے کی مشق کروائیں۔ ۲۔ اساتذہ اُردو ادب میں مضمون نگاری کی روایت بتائیں۔

۳۔ اساتذہ طلبہ کو اُردو ادب میں سجاد حیدر یلدرم کے مقام سے آگاہ کریں۔

# مرزا ادیب

مرزا ادیب نے ۱۹۱۴ء میں لاہور کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی زندگی بڑی تنگدستی میں گزری۔ اصل نام دلاور علی اور قلمی نام مرزا ادیب ہے۔ ابتدائی تعلیم بھاٹی گیٹ کے ایک پرائمری سکول میں حاصل کر کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہوئے جہاں شعر و شاعری سے رغبت ہوئی۔ بعد میں ڈرامے اور افسانے لکھنا شروع کر دیئے۔ بی۔اے پاس کر کے تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا۔

۱۹۳۶ء میں ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر بنے۔ عمر کا زیادہ تر حصہ اس رسالے کی ادارت میں گزارا۔ چھ سال ممبئی میں رہ کر فلموں میں کام کیا۔ ۱۹۴۱ء میں ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ مختصر ڈرامہ کو ترقی دینے اور اسے مقبول بنانے میں مرزا ادیب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ کردار نگاری کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے جس قدر آج کل ڈرامہ نویس دینے لگے ہیں۔ اُن کے کرداروں میں غیر معمولی کردار نہیں ہوتے اور رومانوی کردار بہت کم ہوتے ہیں۔ مرزا ادیب کے کردار عام زندگی کی تصویریں ہیں۔ مرزا ادیب آسان، سیدھی سادی روزمرہ بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔ ''لہو اور قالین، فصیل شب، پس پردہ'' اور ''شیشے کی دیوار'' کا شمار اُردو کے بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔ مرزا ادیب کا انتقال ۱۹۹۹ء میں لاہور میں ہوا۔

# شہید

(مرزا ادیب)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ جذبہ حب الوطنی کو اُجاگر کرنا۔
۲۔ طلبہ کو ڈرامے کے فنی لوازم سے آگاہ کرنا۔
۳۔ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے طلبہ میں ایثار کے جذبے کو فروغ دینا۔
۴۔ مرزا ادیب کے نثری اسلوب کے اوصاف بتانا۔

**مشکل الفاظ:** ادھیڑ عمر ، پلو ، چھدری ، ڈھنگ ، رخسار ، قوسِ قزح

کردار۔ رضیہ، ماں، باپ، شاداں اور ایک سایہ
منظر۔ زمانہ 6 ستمبر 1965ء
مقام۔ شہر قصور کی ایک نواحی بستی
جائے وقوع۔ ایک دو منزلہ مکان کا نچلا کمرہ
وقت۔ شام

اسٹیج جس کمرے کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہمیں پہلا تاثر یہ دیتا ہے کہ ستمبر 1965ء کی بھارتی بمباری سے یہ مکان جس کا یہ کمرہ ایک حصہ ہے۔ کافی حد تک متاثر ہو چکا ہے اور اب گھر والے اس کی آرائش و زیبائش کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

کمرے کا سامان کسی ترتیب سے نہیں رکھا گیا۔ دیواروں میں کچھ دراڑیں دکھائی دے رہی ہیں۔ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ جس کا ایک پٹ کھلا ہے۔ اس پٹ میں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔ دوسرا دروازہ دائیں دیوار میں جس کے آگے صحن ہے۔ باہر اندر آنے کے لئے یہی دروازہ استعمال ہوتا ہے۔

کمرے کے درمیانی حصے میں ایک میز، اس پر پھولوں سے یکسر محروم دو گلدان، چائے کی ٹرے، چند

خالی پیالیاں، ایک پلیٹ، پلیٹ پر روٹی کے کچھ ٹکڑے، ان کے علاوہ جاوید کی کم و بیش ایک فٹ اونچی اور ایک فٹ سے کچھ کم چوڑی تصویر کے رنگین فریم کے اوپر ایک سنہری ہار، یہ ہار فریم کے اوپر سے ہوتا ہوا میز پر پھیلا ہوا ہے۔

ادھر ادھر چار کرسیاں، ایک صوفہ سیٹ، صوفوں پر میلے کپڑے، کتابیں اور اخبارات، کمرے کے بلب روشن ہیں۔

پردہ اٹھنے پر ہم رضیہ کو دیکھتے ہیں جو میز کے پاس ایک کرسی پر اس انداز سے بیٹھی ہے کہ اس کا سر میز کے سرے پر جھکا ہوا ہے اور بانہوں نے سر اور چہرے کو اپنے حلقے میں لے رکھا ہے۔ اس کا جسم مسلسل کانپ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سسکیاں بھر رہی ہے۔ صحن والے دروازے سے ماں آتی ہے۔ چالیس کے لگ بھگ، چہرہ اداس اور ستا ہوا، لباس شلوار قمیض اور دوپٹہ، وہ بیٹی پر نظر جمائے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے پاس آتی ہے اور جھک کر آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے (رضیہ کی کپکپاہٹ بڑھ جاتی ہے)۔

ماں: رجو......نہ بیٹی! نہ

(ماں یہ فقرہ کہتے ہوئے نفی میں اپنا سر ہلاتی ہے اور رضیہ کو اٹھانے کی کوشش کرتی ہے)۔

رضیہ: (سر اٹھائے بغیر) ام۔ امی۔ می!

ماں: اٹھو......رجو! اٹھو نا بی بی رانی!

(ماں اس کے دائیں بازو پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)۔

شاباش اٹھ بیٹھو!

(رضیہ اٹھنے لگتی ہے، سسکیاں ابھی تک جاری ہیں۔ رخسار آنسوؤں سے تر معلوم ہوتے ہیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی ہیں) وہ اٹھ کر نگاہیں جھکائے کھڑی ہے۔ ماں شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔

رضیہ کی عمر دس برس سے زیادہ نہیں۔ لباس وہی ہے جو ماں کا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر ماں کو دیکھتی ہے۔ اور پھر بے اختیاری کے عالم میں دائیں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔ ماں کہتی ہے "چپ بیٹی! چپ"۔

رضیہ: (ماں سے الگ ہوتے ہوئے) امی!

ماں: جاؤ بیٹی۔ منہ ہاتھ دھولو۔

(رضیہ صحن والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ ماں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے، جب وہ دروازے میں سے گزر جاتی ہے تو تصویر کو دیکھتی ہے۔ ایک آہ بھرتی ہے اور ٹرے میں پلیٹ اور خالی پیالیاں رکھنے لگتی ہے۔ صحن والے دروازے سے باپ آتا ہے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی' کمر کسی قدر جھکی ہوئی، چھدری داڑھی، آنکھوں پر عینک، ہاتھ میں چھڑی، پاجامے، کرتے اور واسکٹ میں ملبوس، دائیں شانے پر پیلے رنگ کا پٹکا، چہرہ افسردہ مگر معلوم ہوتا ہے اپنی افسردگی پر قابو پانے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ ماں اپنے کام میں مصروف ہے)۔

باپ: فاطمہ!

(ماں ٹرے وہیں میز پر رکھ دیتی ہے)

ماں: آپ کہاں چلے گئے تھے۔

باپ: یہیں تھا، رجو کہاں گئی؟

ماں: میں آئی تو میز پر سر رکھ کر رو رہی تھی!

باپ: بچی ہے نا۔ صبر آتے آتے آئے گا!

ماں: اور آج کے دن تو زخم ہرے ہو گئے ہیں ہم سب کے!

باپ: آج کے دن۔ (فقرہ مکمل نہیں کرتا) اور اب کہاں ہے؟

ماں: میں نے کہا تھا۔ منہ دھولو، غسل خانے میں گئی ہے!

باپ: یہ ہار کس نے ڈالا ہے؟

(باپ آگے بڑھ کر چھڑی میز پر رکھ دیتا ہے اور تصویر پر نظر ڈالتا ہے)۔

ماں: رجو نے...... بھائی کے گلے میں تو ڈال نہ سکی۔ اس کی تصویر۔

(ماں فقرہ مکمل نہیں کر پاتی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگتی ہے)۔

باپ: اللہ کو یہی منظور تھا فاطمہ!

ماں: اچھا اللہ کی مرضی!

باپ: یہ سعادت دنیا میں کسی بڑے خوش قسمت ہی کے حصے میں آتی ہے۔

شہادت کو تم کیا سمجھتی ہو؟۔ وطن کی خاطر جان دینے کا شرف کسی خوش قسمت ہی کو ملتا ہے۔

ماں: اچھا اللہ ہمیں صبر دے! میں نے کہا رجو کے ابا!

(ماں سر اٹھا کر شوہر کو دیکھتی ہے)

باپ: کہو!

ماں: تصویر اٹھا کر کہیں اور نہ رکھ دوں! (ماں شوہر کے جواب کا انتظار کیے بغیر تصویر اٹھانے لگتی ہے، دروازے پر رضیہ آتی ہے)۔

باپ: رہنے دو (ماں تصویر وہیں رکھ دیتی ہے۔ رضیہ آتی ہے اور ہار کی ترتیب درست کرنے لگتی ہے۔ ماں اور باپ دونوں کی نظریں اس پر جمی ہیں)۔

باپ: رجو بیٹی!

رضیہ: جی ابا جان!

(رضیہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہار کا جائزہ لینے لگتی ہے)

باپ: تم نے پرسوں ترسوں کہا تھا مجھ سے کہ واپسی پر تمہارے لئے ٹافیاں لیتا آؤں مجھے یاد ہی نہیں رہی یہ بات! چلو اب لے آیا ہوں جو ٹافیاں اچھی لگیں، لے لینا۔ (رضیہ نفی میں سر ہلاتی ہے)۔

(باپ دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ رضیہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے)

ماں: جاؤ رجو! تمہارے ابا جی کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کا کہا نہیں مانو گی؟

(رضیہ دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگتی ہے۔ دونوں دروازے میں سے نکل جاتے ہیں۔ ماں تصویر کو دیکھتی ہے اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ ''میرے اللہ'' وہ میز کے پاس کھڑی ہے کہ صحن والے دروازے سے آواز آتی ہے۔ ''رضیہ'' ماں مڑ کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے آؤ ''شاداں بہن!''۔ دو تین لمحوں کے بعد شاداں آتی ہے۔ ماں کی ہم عمر، لباس وہی۔ شاداں آگے بڑھتی ہے۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا ہے۔ مگر جیسے ہی نظر تصویر پر پڑتی ہے۔ اداس ہو جاتی ہے۔

شاداں: کیا بات ہے؟ آج دن بھر اوپر نہیں آئیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم لوگ گھر پر ہو نہیں، اتنی خاموشی!

ماں: ہم تو کہیں بھی نہیں گئے۔ یہیں دن بھر رہے!

شاداں: کوئی آواز نہیں آئی نہ تمہاری نہ رضیہ کی!

ماں: کیا بتاؤں بہن!

شاداں: خیر تو ہے۔کوئی خاص بات۔

ماں: آج جاوید کی چوبیسویں سالگرہ ہوتی!

شاداں: ۶؍ستمبر کو!

ماں: یہی اس کے پیدا ہونے کا دن ہے اور یہی دن...... (ماں شدت تاثر سے خاموش ہو جاتی ہے)۔

شاداں: کتنا خوبصورت نوجوان ہے۔

ماں: تصویر تو اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔تمہارا کنبہ پچھلے سال یہاں نہیں تھا ورنہ تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں اب تو......

شاداں: تصویر ہی کو دیکھا جاسکتا ہے!

ماں: یہی دن تھا...... صبح سے گھر میں بڑی رونق تھی۔ میری رجو نے یہاں رنگا رنگ جھنڈیاں لگا رکھی تھیں۔ سب عزیز، ہمسائے، دوست جمع کرر کھے تھے۔اتنی چہل پہل، اتنا ہنگامہ تھا کہ لگتا تھا کہ کسی کی شادی ہو رہی ہے۔ رجو کو بھائی کی سالگرہ منانے کا بڑا شوق تھا۔ کئی مہینوں سے وہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ دوست احباب میرے جاوید کو تحفے دے رہے تھے۔ رجو نے ایک ایک پیسہ جمع کر کے جو سنہری ہار خریدا تھا وہ الماری سے نکال کر خوشی خوشی بھائی کی طرف لے جا رہی تھی کہ عین اس وقت...... (ماں ایک لمحے کے لئے رک جاتی ہے)۔

شاداں: کیا ہوا۔

ماں: دروازے پر دستک ہوئی۔ جاوید کو فوج میں شامل ہونے کا حکم ملتے ہی وہ جانے لگا۔ہم نے روکا تو کہنے لگا وطن نے پکارا ہے۔ میں نہیں رک سکتا۔

شاداں: اسی وقت چلا گیا۔

ماں: اسی گھڑی، اسی لمحے! بہن کہتی رہی۔ بھائی جان! یہ ہار تو گلے میں ڈال لو مگر نہ مانا۔ بولا۔ واپس آ کر یہ ہار گلے میں ڈالوں گا۔ اور چلا گیا۔ رجو ہار ہاتھ میں لے کے گلی میں نکل گئی لیکن......

شاداں: اور وہ واپس نہ آیا! (ماں اس کے جواب میں کچھ نہیں کہتی۔صرف اک آہ بھرتی ہے)۔

شاداں: میں بھی سوچتی تھی آج بات کیا ہے...... رضیہ کہاں ہے؟

ماں: تمہارے آنے سے دو تین منٹ پہلے اپنے باپ کے ساتھ باہر گئی ہے۔

شاداں: میرے ہاں نہیں بھیج دیا اسے...... عذرا دل بہلا لیتی اس کا۔

ماں: بڑی اداس ہے۔

شاداں: اداس کیوں نہیں ہوگی (جاتے ہوئے) اب بھیج دینا۔

ماں: اچھا!

(شاداں صحن والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے اور چلی جاتی ہے...... شاداں چلی گئی ہے مگر ماں ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی ہے۔ میز پر سے ٹرے اٹھاتی ہے۔ اس کے اوپر باقی پیالیاں رکھنے لگتی ہے۔ رضیہ آتی ہے۔ ہاتھ میں ایک لفافہ وہ لاکر میز پر رکھ دیتی ہے)۔

ماں: رجو!

رضیہ: جی!

ماں: عذرا نے تمہیں بلایا ہے۔

رضیہ: کل جاؤں گی۔

ماں: بیٹی! اس نے بلایا ہے۔ اس کی ماں کہہ کر گئی ہے کہ رضیہ کو ہمارے ہاں بھیج دینا۔

رضیہ: چلی جاؤں گی۔

ماں: جلدی جاؤ۔ میں برتن صاف کردوں۔ صبح سے پڑے ہیں۔ (ماں پلیٹ اور پیالیاں لے کر سیڑھیوں والے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ ایک منٹ کے بعد وہ سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ رضیہ وہیں کھڑی رہتی ہے۔ آگے بڑھ کر تصویر کے قریب ہوجاتی ہے۔ روشنی مدھم ہونے لگتی ہے۔ یہ روشنی اتنی مدھم ہوچکی ہے کہ سٹیج پر اب جو بھی موجود ہوگا وہ واضح طور پر نظر نہیں آئے گا۔ صحن والے دروازے کی طرف سے ایک سایہ بڑھتا ہے۔ یکا یک رضیہ کی آواز ابھرتی ہے۔

رضیہ: بھائی جان!

جاوید: رضیہ!

رضیہ: آپ......اوہ...... بھائی جان! کہاں تھے!

جاوید: یہاں وہاں، جہاں تہاں! ہر جگہ، ہر مقام پر! کہاں نہیں تھا میں؟

رضیہ: آپ تو میدان سے لوٹے ہی نہیں تھے۔ ابا جی کہتے تھے کہ انہوں نے آپ کا لہو سے بھرا ہوا جسم دیکھا تھا۔ اور بھائی! آپ بھائی جان ہیں نا؟

جاوید: تم دیکھ نہیں رہیں مجھے!

رضیہ: ہائے رے ہمیں آپ کا کتنا انتظار تھا۔

جاوید: مجھے معلوم تھا۔ میری بہن میرا انتظار کر رہی ہے۔

رضیہ: معلوم ہے آج کونسا دن ہے۔

جاوید: ۶ ستمبر۔ میری سالگرہ کا دن!

رضیہ: پچھلے سال اسی دن میں نے اپنا گھر سجایا تھا۔ کتنی رونق تھی ہمارے یہاں۔ کتنے لوگ آئے تھے اور آپ کو معلوم ہے؟

جاوید: مجھے سب کچھ معلوم ہے!

رضیہ: میں کتنا خوبصورت ہار آپ کے لئے لائی تھی خرید کر!

جاوید: وہ ہار میں اب بھی دیکھ رہا ہوں!

رضیہ: میری کتنی آرزو تھی کہ یہ ہار آپ کے گلے میں ڈالوں۔ مگر آپ چلے گئے۔

جاوید: اسی لئے تو آ گیا ہوں۔

رضیہ: کس لئے؟

جاوید: وہ ہار تم اب بھی میرے گلے میں ڈال سکتی ہو!

رضیہ: اچھا!

جاوید: کیوں نہیں

رضیہ: تو......اتار دوں ہار!

جاوید: کیوں نہیں۔

(ہار فضا میں لہراتا ہے)

رضیہ: اوہ بھائی جان!

جاوید: اب تو خوش ہونا!

رضیہ: (ہنستے ہوئے) پسند ہے نا یہ ہار آپ کو!

جاوید: اپنی رضیہ کا ہار مجھے پسند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ یہ ہار تو شفق اور قوس وقزح کو گوندھ کر بنایا گیا ہے...... کتنا

پیارا......خوبصورت ہار ہے۔

رضیہ: بھائی جان!

جاوید: ہاں رضیہ!

رضیہ: آپ دروازے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں۔

جاوید: مجھے جانا ہے۔

رضیہ: نہیں بھائی جان!

جاوید: دیکھو رضیہ میں نے تمہاری خواہش پوری کردی، اب مجھے جانا چاہئے۔

رضیہ: آپ کیوں جائیں گے؟

جاوید: کیونکہ مجھے جانا......اور جانا کہاں ہے۔ پہلے کی طرح یہیں رہوں گا۔ تمہارے آس پاس، صبح کی روشنی میں......دوپہر کی دھوپ میں۔ ہر وقت تمہارے قریب۔ تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں مگر میں تمہیں دیکھا کرتا ہوں۔ صبح سویرے جاتے ہوئے، گھر لوٹتے ہوئے، ابا جان، امی جان سے باتیں کرتے ہوئے، سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ سنا رضیہ!

رضیہ: بھائی جان! نہ جائیں آپ، نہ جائیں (سایہ پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ دوسرا سایہ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ بھائی جان کہتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی سٹیج پر روشنی آجاتی ہے۔ روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ رضیہ دروازے سے کچھ دور کھڑی ہے۔ باپ دروازے میں سے بڑھ رہا ہے)۔

رضیہ: وہ آئے تھے۔ (ماں آتی ہے)

ماں: کون آئے تھے؟

رضیہ: بھائی جان......ابھی یہیں تھے......میں نے ان کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

ماں: اچھا۔ (ماں اور باپ دونوں کی نظریں ہار پر جاتی ہیں جو تصویر کے گرد بدستور دکھائی دے رہا ہے)۔

باپ: بیٹی! جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں۔ (آہ بھرتا ہے)۔

رضیہ: کہتے تھے تم میرے گلے میں ہار ڈالنا چاہتی تھی اس لئے آگیا ہوں۔ میرے گلے میں ہار ڈالو۔

ماں: بھائی کے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی نا!

(شاداں آتی ہے)۔

شاداں: ماں سے رضیہ کو تم نے بھیجا کیوں نہیں۔ عذرا انتظار کر رہی ہے۔

(حیران ہو کر) کیا ہوا...... معاملہ کیا ہے؟

ماں: کہتی ہے بھائی جان آئے تھے اور میں نے ان کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

شاداں: خواب دیکھا ہوگا!

رضیہ: نہیں چاچی! میں نے اپنے ہاتھوں سے ان کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔

شاداں: ہار تو وہ پڑا ہے بچے! (شاداں آگے بڑھ کر ہار اٹھانے کی کوشش کرتی ہے کہ یکا یک چونک کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیتی ہے)۔

ماں اور باپ (ایک ساتھ) کیا ہوا؟

شاداں: ہار پر لہو۔

(ماں جلدی سے ہار اٹھا لیتی ہے)۔

ماں: سچ۔ لہو!

ماں، باپ اور شاداں حیرت سے ہار کو دیکھ رہے ہیں۔ رضیہ کی نگاہیں دروازے پر جمی ہیں اور اسی حالت میں جلدی سے پردہ گرتا ہے۔ (از پس پردہ)

(لہو اور قالین)

# مشق

ا۔ مختصر جوابات دیں۔

(الف) یہ ڈرامہ کس جنگ کے واقعہ پر مبنی ہے؟

(ب) جاوید کس تاریخ کو پیدا ہوا اور اس کی شہادت کس تاریخ کو ہوئی؟

(ج) اسٹیج پر کمرے کی حالت بیان کریں۔

(د) رضیہ اور شاداں کے درمیان کیا رشتہ تھا؟

(ہ) رضیہ کی ماں کی عمر کتنی تھی؟

(و) وہ سایہ جو رضیہ کو نظر آیا کس کا تھا؟

(ز) باپ نے شہید کے بارے میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا؟

(ح) جب جاوید کو فوج میں شامل ہونے کا حکم ملا تو اُس کا کیا ردِعمل تھا؟

(ط) جاوید کے فوج میں شامل ہونے کے دن گھر کا ماحول کیسا تھا؟

(ی) جب شاداں نے ہار اُٹھانے کی کوشش کی تو یکا یک ہاتھ کیوں پیچھے کیا؟

۲۔ مرزا ادیب نے اس ڈرامے میں کیا پیغام دیا ہے؟

۳۔ اس ڈرامے کے کرداروں کے نام لکھیں۔

۴۔ اس ڈرامے کو مختصر کہانی کی صورت میں تحریر کریں۔

۵۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کے معنی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

سسکیاں بھرنا ۔ ڈھانپ لینا ۔ زخم ہرے ہونا ۔ چہل پہل ہونا ۔ دل بہلانا ۔ سعادت

شرف ۔ بدستور ۔ جہاں تہاں

۶۔ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی بیان کریں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ کے مترادف الفاظ لکھیں۔

آرائش ۔ دراڑیں ۔ نظریں ۔ رخسار ۔ ضمن ۔ حسین ۔ آرزو

## سرگرمی

ڈرامہ پڑھاتے ہوئے مختلف طلبہ کو ڈرامے کے کرداروں میں تقسیم کر کے اُن کے درمیان مکالمہ کروایا جائے اور کرداروں کے لب و لہجے کو سمجھ کر ادائیگی کی ترغیب دی جائے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ پاکستان پاک فوج کے جاں نثار شہیدوں کی قربانیوں کی بدولت قائم و دائم ہے۔

۲۔ اس بات کی وضاحت کی جائے کہ شہید کا اسلام میں بہت بلند مرتبہ ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

۳۔ طلبہ کو مرزا ادیب کی ڈرامہ نگاری کی چیدہ چیدہ خصوصیات سے آگاہ کیا جائے۔

# مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق ۱۸۷۵ء میں ہاپڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ علی حسن پنجاب میں ملازم تھے۔ اسی لئے ان کا بچپن اور لڑکپن فیروز پور میں بسر ہوا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ۱۸۹۴ء میں بی۔اے پاس کیا۔

مولوی عبدالحق کو سرسید، حالی اور محسن الملک جیسے بزرگوں سے دلی عقیدت تھی۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد بمبئی چلے گئے۔ اور وہاں سے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ جہاں مدرسہ آصفیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ پھر ہوم سیکرٹری کے محکمہ میں مترجم کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہاں ایک عرصہ تک کام کیا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ اورنگ آباد میں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اسی سال ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں انہیں شعبہ ترقی اُردو کا سیکرٹری چُن لیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ کی بنیاد کا سہرا انہی کے سر پر ہے۔ یہ مولانا کی کوششوں کا بڑا میٹھا ثمر تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اورنگ آباد عثمانیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اور ایک عرصہ تک سرکاری سروس میں رہے۔ ۱۹۳۵ء میں پنشن لے لی۔

تقسیمِ برصغیر کے بعد ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور یہاں آ کر مرتے دم تک اُردو زبان و ادب کے فرغ کے لئے کوشاں رہے۔ ان کی اَن تھک کوششیں اَن گنت ہیں۔ اور یہ داستان بہت طویل ہے جسے سمیٹنا بھی چاہو تو پھیلتی چلی جائے گی۔ تقریباً نصف صدی تک اُردو زبان کی خدمت کرنے والا یہ بلبل ہندوستان ۱۹۶۱ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

# نام دیو...... مالی

(مولوی عبدالحق)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو محنت کی عظمت سے روشناس کروانا۔

۲۔ طلبہ کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو دی گئی صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔

۳۔ طلبہ کو مولوی عبدالحق کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔

**مشکل الفاظ:** اپج ، باولی ، تھانولا ، تفویض ، جھلڑ ، ٹانگا

نام دیو مقبرۂ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڈ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جیسی اونچی ذات والوں میں:

ے قیس ہو کوہ کن ہو یا حالؔی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا' لکھتے لکھتے کبھی نظر اُٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کیا اور ہر رُخ سے پودے کو مُڑ مُڑ کر دیکھا۔ پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مُسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔

اَب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے؟ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا' ان کو پیار کرتا' جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اُسے بڑی فکر ہوتی۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اُسے بچالیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اُسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لئے آتے تھے وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اُسے علاج کے لئے بُلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا' مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف سُتھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست' سنچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر' جھاڑنا بُہارنا' صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سایے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سُننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مُرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کی بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا اُٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بُجھاتا' جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا' یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اُسے انعام دینا چاہا تو اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظمِ تعلیمات کو تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے' مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا' وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز و شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگرانِ کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے' ٹوکیو سے جاپانی' تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلومہ تھا۔ البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے' سیندھی شراب پیتے' یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ اپنے کام میں لگا رہا اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دیدی۔ میں کہتا ہوں اُسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے، جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔

(چند ہم عصر)

## مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجئے۔

(الف) کسی پودے کو کیڑا لگ جاتا تو نام دیو کیا کرتا؟

(ب) نام دیو بچوں کے علاج کے لئے ادویات کہاں سے حاصل کرتا؟

(ج) پانی کی قلت کے زمانے میں نام دیو پودوں کو کیسے سیراب کرتا؟

(د) مصنف نے نام دیو کو انعام کی پیش کش کی تو اس نے کیوں انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا؟

(ہ) نیکی کب تک نیکی رہتی ہے؟

(و) نام دیو کی موت کیسے ہوئی؟

۲۔ سبق ''نام دیو مالی'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجئے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔

میز ۔ ڈول ۔ حوض ۔ کیچڑ

۴۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کیجئے۔

شناخت ۔ روش ۔ مستحق ۔ اعتبار ۔ یورش

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیئے۔

مصروف ۔ بیمار ۔ درست ۔ توانا ۔ پاک ۔ کاہل ۔ ویران ۔ نیکی

۶۔ مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجئے۔

آفت ٹوٹ پڑنا ۔ اوسان خطا ہونا ۔ بے دم ہو جانا ۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا

۷۔ درج ذیل الفاظ کے معانی لکھیں۔

سیوا ۔ جتن ۔ تامل ۔ مجال ۔ تلف ۔ تفویض ۔ ٹھاٹ

۸۔ نام دیو مالی کے کردار کے حوالے سے اس کے چند اوصاف بیان کریں۔

## سرگرمی

طلبہ سے ''محنت میں عظمت ہے'' کے موضوع پر تقریر کروائی جائے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات سے آگاہ کیا جائے۔
۲۔ طلبہ کو اسلوبِ نثر کی خصوصیات بتائی جائیں۔
۳۔ کامیابی کے لئے محنت و مشقت کی تلقین کی جائے اور محنت میں عظمت سے متعلق کوئی واقعہ طلبہ کو سنائیں۔
۴۔ سبق میں الطاف حسین حالی کا جو شعر آیا اُس کی وضاحت کریں۔

# مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بدخشاں سے آئے تھے۔ دربار میں ان کی بڑی عزت و تکریم تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے سینٹ سٹیفنز کالج سے بی۔اے کیا۔ اس کے بعد ریاست حیدر آباد چلے گئے اور چند دن بعد اسسٹنٹ سیکرٹری ہو گئے۔ حیدر آباد کی ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں، جنھوں نے مرزا کے ادبی ذوق کو اُبھارا اور بڑی استقامت بخشی۔ ان کی مزاح نگاری بہت پسند کی گئی۔ تحقیقی مقدمہ نگاری میں بھی مرزا صاحب اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مگر ان کی زیادہ شہرت مزاحیہ تحریروں ہی کی وجہ سے ہوئی۔

ان کے مضامین میں نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی، آخری وصیت، پھول والوں کی سیر، دادا جان کا پارلیمنٹ میں جانا، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

مرزا صاحب سادہ طرزِ بیان کے دلدادہ ہیں۔ ہر جگہ ظرافت ایک معقول سنجیدگی میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان، الفاظ کا انتخاب، پُرکشش اندازِ بیان اور ان سب پر ظرافت کا رنگ پڑھنے والے کی توجہ کو جذب کر لیتا ہے۔

۲۷ راپریل ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد میں انتقال کر گئے۔

# مردہ بدست زندہ

(فرحت اللہ بیگ)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو طنز و مزاح کے معنی و مفہوم سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو موجودہ قبرستانوں کی بدحالی سے آگاہ کرنا۔
۳۔ طلبہ کو موجودہ دور میں انسان کی بے مروتی اور ابن الوقتی سے آگاہ کرنا۔

**مشکل الفاظ:** بلیات ، پاکھا ، پٹاؤ ، جائے وحشت ، چھاج ، حیات و ممات

زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دِلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ”واہ، جیتے جی تو دوستی و محبت کا دم بھرا جاتا تھا، مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔“ اب رہی دل کی حالت، تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آئیے، میرے ساتھ آئیے، آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجیے، سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہیں، موٹریں بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہیں، غریب بھی ہیں، امیر بھی ہیں، بچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں، کچھ پڑھ بھی رہے ہیں، جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں، یا دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے ”کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے۔“ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے، تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے، ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی، دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں، ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ پہنچا

کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازے کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ اُدھر، آگے آگے جنازہ ہے، اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی؟ جن کو پیچھے رہنا تھا انہوں نے چال آہستہ کر دی، جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اُجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں، یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدے دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا، جھک کر سلام کیا، گھر بھر کی مزاج پرسی کی، مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے، اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں، اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے، ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آگئے اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا کر کپڑے بدل کر خاص اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں، یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار، کسی موڑ یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی، یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انہوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے، بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا، اب راستے والوں کی سنیئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا؟ اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے، مرنے والے کا نام پوچھا، مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کو تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھی کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا

ان کو زہر معلوم ہوتا ہے، اور کیوں نہ ہو، موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مرکر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے، لوگ ہیں کہ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے؟ خاصا ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ہے، اس میں ایک سقے صاحب، ان کی بیوی، دس بارہ بچے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، سو دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں؟ جس حصے میں قبریں ہیں، وہاں کی گھاس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں۔ نیم، پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے، کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کسمپرسی نے اس حصے کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ، جس میں قبریں نہیں ہیں، وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصے کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے، ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپے کھرے کر چکے، اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصے کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دکان دار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو، پھر تم جانو اور تمھارے مردے جانیں۔

میاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا حرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا، مردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں سل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ، جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں بھرتی پھرتی ہیں، مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں، بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار

رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ کسی بچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے۔ اس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھاس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری، کسی کا چونا گرا، کسی کا پتھر گرا، اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلے کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا؟ فوج میں ٹُرم بج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ، جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے، لائن باندھ کر آبیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورا ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی، کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے، خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیئے۔ جنازہ لا کر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو بُرا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے، چبوترے کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سُلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے، سُلفے پر سُلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھاس سے بچتے بچاتے، قبروں پر کودتے پھاندتے، چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے، آج شرما شرمی قبرستان میں آئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں، اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے، دادِ سخن دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا، کچھ ان کا سنا، غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کو نکال لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں، ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جارہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں، وعدے لیے جارہے ہیں، غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے، کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اُتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا، آٹھ دس نے غل مچایا۔ ''سنبھال کے، سنبھال کے، میت بھاری ہے، کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں! اپنی طرف گھسیٹو، ہاں آہستہ سے، آہستہ سے۔'' اب میت قبر کے منہ تک آ گئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انہوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے ''ذرا کمر کی چادر کھینچو، ارے بھئی! اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے۔ ہاں، ہاں، ذرا اور جھکا کر، لاالہ الا اللہ میت بھاری ہے، ذرا سنبھال کے، آہستہ، آہستہ، بس بھئی بس۔'' کوئی چیخ رہا ہے! مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں! لو، یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلے کی طرف تو کر دو، واہ بھئی واہ، اتنا بھی نہیں آتا، ابھی منہ پورا نہیں پھرا، بس بھئی بس۔''

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں، کیا نہ کریں؟ بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے، کوئی کہتا ہے ''یہ کڑی نہیں، وہ کڑی لو۔'' کوئی کہتا ہے ''لاحول ولاقوۃ'' مفت میں سو روپے مار لئے اور کڑیاں دیں تو ایسی۔'' غرض کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے، منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں؟ البتہ لفظ ''منہا'' بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی ہے۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے، جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں؟ فاتحہ

پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے؟ ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آ کر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ "فاصلہ بہت تھا" کبھی کہتے ہیں کہ "آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں، وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا۔" بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانے کی میت کا رنگ، جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ ان بندوں کو نیک ہدایت دے، ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں؟

(مضامین فرحت اللہ بیگ)

## مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

(الف) مصنف نے ماضی اور حال کا جو نقشہ کھینچا ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

(ب) نماز جنازہ کے دوران لوگ کس طرح تقسیم ہو گئے؟

(ج) قبرستان کے دو حصے ایک دوسرے سے کیوں مختلف ہیں؟

(د) میت دفنانے کے وقت وہاں جمع لوگ کیا کر رہے تھے اور اُنھیں کیا کرنا چاہئے تھا؟

(ہ) اس مضمون سے آپ کو کیا سبق ملا؟

(و) مفت کرم داشتن، سے مصنف کی کیا مراد ہے؟

۲۔ درج ذیل عبارت کی سلیس اُردو بحوالہ متن تحریر کریں۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیئے۔ جنازہ لا کر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی

مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پلاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو بُرا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے، چبوترے کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔

۳۔ درج ذیل الفاظ تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

تفویض، جائے عبرت، کسمپرسی، حرج، خفتگانِ خاک، دادِ سخن، متمکن، فراغت

۴۔ درج ذیل بیانات میں سے درست کی نشاندہی (✓) اور غلط کی (✗) سے کریں۔

(الف) زمانہ حال میں، زمانہ ماضی کے مقابلے میں لوگوں میں خلوص بڑھ گیا ہے۔

(ب) مکان کے اندر صرف غریب ہی کچھ پڑھ رہے تھے۔

(ج) امراء صرف واجبی رسم پورے کرنے آتے تھے۔

(د) قبرستان کی حالت تسلی بخش تھی۔

(ہ) جنازے میں موجود بہت ہی کم لوگ فاتحہ میں پڑھنے والی سورتیں جانتے تھے۔

۵۔ متن کو مدنظر رکھتے ہوئے دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

(الف) جس کا انتقال ہوا وہ:

۱۔ غریب آدمی ہے ۲۔ امیر آدمی ہے ۳۔ بڑا شخص ہے

(ب) قبرستان میں بیشتر لوگ:

۱۔ درود شریف پڑھتے رہے ۲۔ خاموش کھڑے رہے

۳۔ سگریٹ بیڑی کا دَم لگاتے رہے

(ج) مکان پر غریب آتے تو اندر جا کر:

۱۔ سپارہ پڑھتے ۲۔ گپ شپ کرتے ۳۔ سگریٹ پیتے

(د) نماز جنازہ پڑھائی گئی:

۱۔ عیدگاہ میں ۲۔ مسجد میں ۳۔ کھلے میدان میں

(ہ) جنازے کے ساتھ بڑے لوگ ہوئے تو دکاندار چلے آ رہے ہیں:

۱۔ بھاگتے ہوئے ۲۔ ننگے پاؤں ۳۔ آہستہ آہستہ

(و) میت کو قبر میں اُتارتے وقت اِردگرد جمع لوگوں نے:

۱۔ شور مچایا ۲۔ ایک دوسرے کی مدد کی ۳۔ بلند آواز سے کلمہ پڑھا

۶۔ ذیل الفاظ کے واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیں۔

**ممات، قصہ، نقص، قبر، خفتگان**

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتائیں کہ مزاحیہ تحریر لکھنے والے ادیب کو مزاح نگار کہتے ہیں۔

۲۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مزاحیہ تحریر میں کوئی نہ کوئی سبق آموز پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔

۳۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے دیگر مضامین خصوصاً خاکہ نگاری کا بھی ذکر کیا جائے۔

# مرزا غالبؔ

مرزا غالبؔ ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام اسد اللہ خان تخلص شروع میں اسدؔ بعد میں غالبؔ رکھا۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ پہلے اودھ کے نواب آصف الدولہ اور نواب نظام علی خان کے درباروں سے منسلک رہے۔ اس کے بعد وہ راجہ بختاور سنگھ کی فوجی ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔

ان کا شمار اردو کے درجہ اول کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ اردو نثر میں انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ غالبؔ سے قبل مراسلت کی عام زبان یا تو فارسی تھی یا پھر ناقابل فہم اور پر پیچ اردو زبان۔ لیکن غالبؔ نے اپنی مراسلت کے لئے جو طرز نگارش اختیار کیا وہ دوٹوک سادہ، آسان، سہل اور مکالمہ کے انداز پر تھا۔ غالب کی نثر کے اس اسلوب کو آج تک کوئی بھی کامیابی کے ساتھ نقل نہ کر سکا۔ غالبؔ شادی ہونے تک آگرہ میں رہے۔ پھر دہلی آئے اور یہیں کے ہو کے رہے۔ وہ بے مثال شاعر تھے۔، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

# خطوطِ غالب

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو مکتوب نگاری کی اہمیت سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو مرزا غالب کی شخصیت اور عادات سے آگاہ کرانا۔

۳۔ طلبہ کو بتا دینا کہ خطوط غالب کا شمار اُردو زبان کے نہایت اہم شہ پاروں میں ہوتا ہے۔

۴۔ جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کے حالات پر روشنی ڈالنا۔

**مشکل الفاظ:** اختلاط ، اہل حرفہ ، تحویل ، لوح ، ناگاہ ، ہنود

# ۱۔ بنام منشی ہرگوپال تفتہ

(اس خط میں غالب نے اپنے شاگرد تفتہ کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دلی کے حالات لکھے ہیں۔)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے، اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا، کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو، تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں، گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والئی پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالی نشان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں، چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔

جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں ملازم ہوئے اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے، کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی؟ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدھم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے؟ یہاں سے باہر اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا اسلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا۔

(غالبؔ)

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

# ۲۔ بنام یوسف مرزا

## (۹مئی ۱۸۶۰ء کا لکھا ہوا)

یوسف مرزا کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا؟ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو؟ مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا، مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کسے کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ۔ ہاں صاحب! وہ لکھتی ہیں کہ پنشن کا روپیہ مل گیا تھا۔ وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید ہو اس کی پنشن کیوں کر ملے گی اور کس کی درخواست سے ملے گی؟ رسید کس سے لی جائے گی؟ مصطفیٰ خان کی رہائی کا حکم ہوا۔ مگر پنشن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں لیکن بہت عجیب بات ہے۔ تمہارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔ قصہ مختصر تمہاری دادی کا خط جو تمہارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا وہ میں نے تمہارے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ ان کی جائیداد کی واگزاشت کا حکم ہو تو گیا ہے اگر ان کے بڑے بھائی کے یاران کو چھوڑیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے؟ مظفر مرزا کو دعا پہنچے۔

تمہارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمہارے چچا کا آغاز اچھا ہے۔ خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمہاری پھوپھی کا اور تمہارا سرانجام دیکھا جاوے گا کہ کیا ہوتا ہے؟ ہوگا کیا؟ اگر جائیدادیں مل بھی گئیں تو قرض خواہ دام دام لے لیں گے۔ رزاق حقیقی پنشن دلوا دے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

شنبہ ۲۷ شوال، ۹ مئی ۱۸۶۰ء

(غالبؔ)

# ۳۔ بنام مرزا علاؤالدین احمد خان علائی

میری جان! نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر دراز کرے۔ تمہاری تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ، ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تا کہ احتمال رفع ہو۔ خط ثاقب کے نام کا تو بہ تو بہ خط کا ہے کو ایک تختہ کاغذ کا ہے۔ سرسری میں نے پڑھا۔ لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا فحوائے عبارت سے جگر خون نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم جدا۔ ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور اور ایسا عیار طرار، یوں عاجز درماندہ واز کار رفتہ ہو جائے۔ تمہارا غم جدا ساغر اول و درد۔ کیا دل لے کر آئے' کیا زبان لے کر آئے' کیا علم لے کر آئے' کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے۔ کسی شیوہ کی داد نہ پائی۔

بھائی اس معرض میں بھی تیرا ہم طالع اور ہمدرد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو داعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پاپیادہ چلوں۔ کبھی شیراز جا نکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ تمہارے حال پر غور کیا اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔ لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفے میں تھا۔ تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے بچوں کی آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

صبح دوشنبہ شانزدہم ازمہ صیام ۱۲۸۱ھ (۱۳ فروری ۱۸۶۵ء) (غالبؔ)

# مشق

۱۔ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) اگرچہ یک فنہ ہوں۔

(ب) ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اِسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔

(ج) نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔

(د) رازقِ حقیقی پنشن دلوادے، تاکہ روٹی کا کام چلے۔

(ہ) نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔

(و) تمہارے چچا کا آغاز اچھا ہے۔ خدا کرے، انجام بھی اسی آغاز کے مطابق ہو۔

(ز) تمہارے حال پر غور کیا، واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔

۲۔ خطوطِ غالب کی مقبولیت کی وجوہات مختصراً بیان کیجئے۔

۳۔ درج ذیل الفاظ ومحاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

خدا کا مقہور، احتمال، طالع، کلیجہ کٹ جانا، ابنائے روزگار، معرض

۴۔ نصاب میں شامل خطوط کو مدِنظر رکھتے ہوئے دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

(الف) غالب نے مرزا یوسف کو خط لکھا تھا:

۱۔ بیوی کی وفات پر ۲۔ باپ کی وفات پر ۳۔ بھائی کی وفات پر

(ب) مرزا غالب نے علاؤ الدین احمد خان علائی کو خط لکھا تھا:

۱۔ بچے کی پیدائش پر ۲۔ شادی کرنے پر ۳۔ حج پر جانے پر

(ج) غالب نے مرزا تفتہ کو خط میں تفصیل بیان کی ہے:

۱۔ دہلی کی بربادی کی ۲۔ لاہور کی بربادی کی ۳۔ لکھنؤ کی بربادی کی

(د) مرزا غالب نے یوسف مرزا کو خط میں کس کے بارے میں لکھا تھا کہ آغاز اچھا ہے، انجام اسی کے مطابق ہو:

۱۔ بھائی کے بارے میں ۲۔ والد کے بارے میں ۳۔ چچا کے بارے میں

(ہ) مرزا غالب نو دس برس سے کس مکان رہتے تھے:

۱۔ ذاتی مکان میں ۲۔ کرایہ کے مکان میں ۳۔ سرکاری مکان میں

۵۔ درج ذیل پیراگراف کی تشریح کیجیے۔

(الف) اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں۔ گھر حکیموں کے اور نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ والئی پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالیشان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔

(ب) خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، تمہارے حال پر غور کیا، اور چاہا اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ، تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے، جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ جو کسی کو بھیگ مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر کی بھیگ مانگے وہ میں ہوں۔

(ج) تمہارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمہارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمہاری پھوپھی اور تمہارا سرانجام دیکھا جاوے گا۔ کہ کیا ہوتا ہے؟ ہوگا کیا؟ اگر جائیداد مل بھی گئی تو قرض خواہ دام دام لے لیں گے۔ رازق حقیقی پنشن دلوا دے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا اسلام نیاز اور میر کاظم کو دُعا۔

۶۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

ضعیف، فقیر، آغاز، ناتواں، بیمار

## سرگرمی

اپنے دوست کو خط لکھیے جس میں یہ بتائیے کہ ایک دلچسپ خط کس طرح لکھا جاتا ہے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کو چاہیے کہ سبق پڑھانے سے پہلے مرزا غالب کی شخصیت کا تعارف کرائیں۔

۲۔ مرزا غالب کی علمی و ادبی حیثیت واضح کریں۔

۳۔ خطوط میں جس طرح کی منظر کشی کی گئی ہے اُس کی وضاحت کریں۔

# حصه نظم

# مولانا الطاف حسین حاؔلی

خواجہ الطاف حسین حاؔلی ۱۸۳۷ء میں خواجہ ایزد بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔نو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی محمد ابراہیم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی آ کر غالب کے شاگرد ہوئے۔۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور آ کر ایک سرکاری بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔

حاؔلی، سرسید احمد خاں کے نامور رفقاء میں سے ہیں۔انہوں نے اُردو نثر اور اُردو شاعری میں بڑا امتیاز حاصل کیا۔ نثر میں مقدمہ شعر و شاعری اور تین بلند پایہ سوانح عمریاں لکھ کر اور شاعری میں مسدس کے علاوہ غزل گوئی کو نئے راستے پر لگا کر ادب اُردو میں بیش بہا اضافہ کیا...... لاہور میں جدید نظم اُردو کی جو تحریک اُٹھی اس کے بانیوں میں حالی بھی ہیں۔

غزل گوئی میں غاؔلب اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ سے بھی اثر قبول کیا۔ان کی کچھ غزلیں پرانے طریقے کی ہیں اور کچھ نئے انداز کی۔نئی غزلوں میں پرانی غزل گوئی کی قابل اصلاح رسموں کو ترک کیا۔

حاؔلی کی غزل میں حقیقت اور جذبات کی سچائی پائی جاتی ہے اور اس پر انہوں نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں زور بھی دیا ہے۔حقیقت سے مراد وہ سچائیاں ہیں جو انسانی عقل و تجربہ سے ثابت شدہ ہوں یا جو انسانی فطرت اور مزاج کے مطابق ہوں۔اسی وجہ سے وہ اپنے کلام میں خیال آرائی اور بیان کی آرائش سے بچنے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

حاؔلی کی اپنی غزل میں خلوص، سادگی اور سچائی ہے۔اسی وجہ سے اس میں تاثیر ہے۔درد بھری باتیں بھی ہیں جو نیچرل طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ بے ضرورت جوش کسی جگہ نہیں اور مٹھاس، تہذیب اور شرافت ہر جگہ نمایاں ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کی علمی قابلیت اور خدمات کے عوض ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا۔۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

# حمد

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو حمد و ثنا کی برکات اور اہمیت سے متعارف کروانا۔

۲۔ طلبہ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ایمان کی پختگی کا احساس پیدا کرنا۔

۳۔ مولانا حالی کے شعری محاسن سے روشناس کروانا۔

**مشکل الفاظ:** ابد ، ازل ، بیگانگی ، عارف ، سر دُھننا ، کامل

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک، وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رُعب جلال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز، دل سے خیال تیرا

اِن کی نظر میں شوکت، جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے، جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان تجھ سے، کیونکر عزیز رکھیئے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

بیگانگی میں حالؔی، یہ رنگ آشنائی
سُن سُن کے سر دُھنیں گے، قال اہل حال تیرا

(مولانا حالؔی)

# مشق

۱۔ حمد کسے کہتے ہیں؟

۲۔ حمد کے دوسرے شعر کی تشریح کریں۔

۳۔ ''مرکب اضافی'' وہ مرکب ہے جو مضاف، مضاف الیہ اور حرف اضافت کا، کے، کی سے مل کر بنے یا بعض اوقات دو اسموں کے درمیان ایک معمولی سا تعلق پایا جاتا ہے جب اسم کو مضاف کیساتھ ظاہر کیا جائے تو مرکب اضافی بنتا ہے۔اس حمد میں سے مرکب اضافی تلاش کر کے لکھیں۔

۴۔ اس حمد میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کی کون کونسی صفات بیان کی ہیں؟

۵۔ حمد کے آخری شعر میں شاعر کا ''بیگانگی'' سے کیا مراد ہے؟

۶۔ اس نظم میں ''ردیف/ قافیے'' کی نشاندہی کریں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

ازل، منکر، بیگانگی، حیرت

۸۔ اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں۔

جلال، پھیلا، عارف، رعب

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو بتائیں کہ ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو، حمد کہلاتی ہے۔

۲۔ اساتذہ طلبہ کو الطاف حسین حالی کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ کریں۔

۳۔ اُردو ادب میں حمدیہ شاعری کی روایت سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

# امیرؔ مینائی

امیرؔ مینائی ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ امیرؔ مینائی کا تعلق مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ مینا سے تھا۔ جو اپنے مورث اعلیٰ کی نسبت سے بڑے دین دار، پرہیزگار اور صاحب علم و عرفان تھے۔ بیس سال کی عمر میں تعلیم کی تکمیل کر لی تھی۔ اس عمر میں وہ واجد علی شاہ کے دربار میں پیش ہوئے۔ اُن کا کلام سننے کے بعد واجد علی شاہ نے دو کتابیں ''ارشاد السلطان'' اور ''ہدایت السلطان'' مرتب کرنے کی ہدایت کی مگر وہ محفل جلد اُجڑ گئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد وہ رام پور چلے گئے۔ جہاں نواب حامد علی خان امیرؔ مینائی سے اصلاح لیتے رہے اور اُن کی مالی مدد کرتے رہے۔ اُنھیں مفتی عدالت تعینات کیا گیا۔ اُن کی ایمانداری اور انصاف پسندی پورے شہر میں مشہور تھی۔ نواب حامد علی خان کا ایک خادم کسی جرم میں گرفتار ہوا۔ نواب نے چاہا وہ بَری ہو جائے۔ مگر امیرؔ مینائی نے انصاف کے تقاضوں کے تحت اُسے سزا دی۔ نواب کو دُکھ ضرور ہوا۔ مگر امیرؔ مینائی کی انصاف پسندی کی تعریف کیے بغیر نہ رہے۔

امیرؔ مینائی کو نعتیہ شاعری میں بلند مقام حاصل ہے۔ اُن کی غزل ایک سدا بہار گلدستہ ہے۔ اُن کی غزلوں میں طرز لکھنؤ کی نزاکت، مرقع کاری، ماحول کی رنگینی اور رنگ دہلی کی سادگی، دردمندی اور درویشی سب کچھ ہے۔ آخری عمر میں دکن چلے گئے جہاں ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔

# نعت

(امیرؔ مینائی)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو نعت کے مفہوم سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کے دلوں میں حضور ﷺ کی عقیدت و محبت کے جذبات پیدا کرنا۔
۳۔ طلبہ کو حضور ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانا۔

**مشکل الفاظ:** جلوہ نما ، روضہ انور ، شبِ معراج ، شاد ، مشتاق ، مَلک

نقشِ قدم ہیں آپؐ کے اختر زمین پر
کیوں کر نہ آسماں کا جُھکے سر زمین پر

اس سے بھی صاف جلوہ نما ہے خدا کا نور
عرشِ بریں ہے روضہء انور زمین پر

تکلیفِ شرع سے نہیں خالی کوئی بشر
قبضہ ہمیشہ آپؐ کا ہے ہر زمین پر

سلطاں ہیں آپؐ، بھیجے ہوئے تھے سب آپؐ کے
آئے تھے پیشتر جو پیمبر زمین پر

ہاتھوں میں اُن کے آپؐ کے بازو کا زور تھا
حیدرؓ جو کافروں سے لڑے ہر زمین پر

یہ شان تھی کہ آپؐ اٹھاتے تھے جب قدم
آنکھیں مَلک بچھاتے تھے اکثر زمین پر

تھی کس خوشی کی شب، شبِ معراجِ مصطفیٰ ﷺ
اُمت تھی شاد عید تھی گھر گھر زمین پر

تا وقتِ صبح گاہ سرِشام سے ہوئے
جاری فیوضِ خالقِ اکبر زمین پر

بس اتنی دیر میں کہ رہی گرمیِ بساط
پھر آئے لامکاں سے پیمبرؐ زمین پر

جاری ہیں بسکہ ماتمِ حضرتؐ میں میرے اشک
موتی بچھے ہوئے ہیں برابر زمین پر

مشتاق ہوں میں خاک مدینہ کا اے امیرؔ
آئے جو موت بھی تو اُسی سرزمین پر

(کلیاتِ امیرؔ مینائی)

# مشق

۱۔ نعت کسے کہتے ہیں؟

۲۔ نعت کے تیسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کریں۔

۳۔ ردیف اُس لفظ یا الفاظ کو کہتے ہیں جو کسی شعر یا مصرعے کے آخر میں قافیہ کے بعد مسلسل دہرائے جائیں۔ جبکہ وہ ہم آواز، ہم آہنگ اور ہم شکل الفاظ جو مصرعے کے آخر میں ردیف سے قبل مسلسل آئیں، قافیہ کہلاتے ہیں۔ لہٰذا

(الف) اس نعت میں استعمال کئے گئے مختلف قافیے لکھیں۔

(ب) اس نعت میں کونسی ردیف استعمال ہوئی ہے؟

۴۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں۔

ملک، مشتاق، فیوض، بساط

۵۔ درج ذیل تراکیب کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

عرشِ بریں، روضۂ انور، شبِ معراج، سرِشام، خالقِ اکبر

۶۔ نعت کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۷۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع جبکہ آخری شعر جس میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہو مقطع کہتے ہیں۔ اس نظم کے مقطع میں شاعر نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے؟

## سرگرمی

۱۔ دو اور نعتیں اپنی کاپی میں لکھیں۔

۲۔ کلاس میں ترنم کے ساتھ بچوں سے نعت سنوائیں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اُستاد طلبہ کو بتائیں کہ ایسی نظم جس میں حضور ﷺ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو نعت کہلاتی ہے۔

۲۔ اُردو ادب میں نعت گوئی کی روایت سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

۳۔ اُردو ادب میں امیر مینائی کے مقام خصوصاً نعت گوئی کی حیثیت سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

# نظیر اکبرآبادی

نظیر کا اصل نام ولی محمد ہے۔ آپ ۱۷۳۵ء میں دِلی میں پیدا ہوئے مگر چونکہ عمر کا زیادہ حصہ اکبرآباد میں گزارا' اس لئے اپنے نام کے ساتھ اکبرآبادی لکھتے تھے۔ بارہ بھائیوں میں صرف نظیر زندہ بچے۔ اس لئے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچے اور تاج محل کے قریب مکان میں رہنے لگے۔ نظیر کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ تاہم وہ عربی' فارسی' ہندی اور ہندوستان کی کئی دوسری زبانیں جانتے تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا۔ اسی مزاج کی وجہ سے وہ درباروں سے دور رہے۔ نواب سعادت علی خان نے انہیں لکھنؤ بُلوایا' وہ نہ گئے۔ اسی طرح بھرت پور کے رئیس کی دعوت بھی ٹھکرادی۔ متھرا میں کچھ عرصہ معلم رہے مگر جلد ہی نوکری چھوڑ کر آگرہ آگئے اور سترہ روپے ماہوار پر لالہ بلاس رام کے بچوں کے اتالیق ہو گئے۔ نظیر نے طویل عمر پائی۔ آخری عمر میں فالج کے عارضے میں مبتلا ہوئے اور اسی بیماری کے باعث ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا۔

نظیر اکبرآبادی نے میر سودا' ناسخ و آتش اور انشاء و جرأت کا زمانہ دیکھا' مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث سب سے الگ رہے۔ اُن کی شاعری عوامی ہے۔ انہوں نے اپنے قرب و جوار کے ماحول' اپنے عہد کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کو بڑی عمدگی کے ساتھ اپنی شاعری میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے شعر و سخن کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا تعلق براہِ راست عوام الناس' بالخصوص غریب اور مفلس طبقے سے تھا۔ ان کی نظموں میں مناظرِ فطرت' مذہبی تہوار' سماجی رسوم' میلوں ٹھیلوں' جانوروں حتیٰ کہ پھلوں اور سبزیوں کا جابجا ذکر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اُردو نظم گوئی کے دامن کو وسیع کیا۔

انہوں نے طویل اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ مناظرِ فطرت' موسموں اور تہواروں پر ان کی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں ان کے غیر معمولی مشاہدے اور زندگی کے گہرے تجربوں کی عکاس ہیں۔ نظیر کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ اُن کی شاعری کا ضخیم کلیات اُردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

# برسات کی بہاریں

(نظیر اکبر آبادی)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو منظر نگاری اور حسین فطرت سے آگاہ کرنا۔

۲۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری سے روشناس کروانا۔

۳۔ اُردو نظم میں نظیر اکبر آبادی کی اہمیت سے آگاہ کروانا۔

**مشکل الفاظ:** جل تھل ، جھجھاہٹ ، کاہی ، قطرات ، گلزار ، ہر جا

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بُوندوں کی جھجھاہٹ، قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اُوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دُھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگل میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ، کچھ اَبر کی سیاہی
اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی
یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی!
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یا رب، سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت
تیتر پُکارتے ہیں سُبحان تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

(کلیاتِ نظیر)

## مشق

ا۔ مختصر جواب دیں۔

(i پہلے بند میں کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

(ii تیسرے بند میں موجود ردیف کی نشاندہی کریں۔

(iii کیا چوتھے بند میں ردیف استعمال کی گئی ہے؟

(iv تیتر اللہ تعالیٰ کی عظمت کیسے بیان کرتے ہیں؟

(v گلزار کے بھیگنے اور سبزے کے نہانے سے کیا مراد ہے؟

۲۔ ''قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۳۔ اِعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں۔

برسات ۔ لہلہاہٹ ۔ گلزار ۔ سبحان ۔ جھجھاہٹ

۴۔ مذکر اور مؤنث کی نشاندہی کریں۔

ہوا ۔ بادل ۔ بہار ۔ برسات ۔ سبزہ ۔ قدرت ۔ گلزار ۔ رنگ ۔ تیتر ۔ گھٹا

۵۔ جس نظم کے ہر بند میں ایک ہی مصرع بار بار دُہرایا جائے اُسے ''ٹیپ کا مصرع'' کہتے ہیں۔ اس نظم میں ٹیپ کے مصرعے کی نشاندہی کریں۔

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں۔

لہلہاہٹ ۔ جل تھل ۔ گلزار ، گھٹائیں ۔ ماہ تا بہ ماہی

۷۔ اس نظم میں شاعر نے برسات کے جو مناظر پیش کیے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک منظر لکھیے۔

۸۔ اس نظم کے ہر بند میں کتنے مصرعے ہیں اور شاعری کی اصطلاح میں اس نظم کو کیا کہتے ہیں؟

۹۔ اس نظم کا کونسا بند آپ کو زیادہ پسند آیا؟ اپنی پسند کی وجہ بھی لکھیے۔

## سرگرمی

کمرہ جماعت میں طلبہ کے مابین مختلف موسموں پر بحث کرائی جائے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا تعارف کروائیں۔

۲۔ طلبہ کو شاعری صنف مخمس کی پہچان کروائیں۔

۳۔ طلبہ کو شاعری کی دیگر اصناف مثلاً غزل، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ بتائیں۔

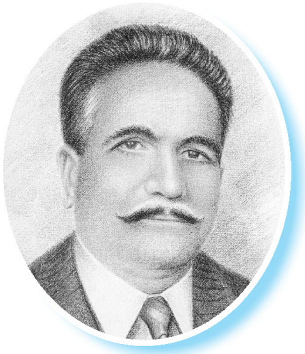

# علامہ محمد اقبالؒ

ہمارے قومی اور ملی شاعر، مفکر اور نظریہ پاکستان کے خالق علامہ محمد اقبالؒ ۱۸۷۷ء سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم۔اے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئے اور وہاں سے بار ایٹ لاء اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وطن واپسی پر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۳۰ء میں خطبہ الہ آباد میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک کا نظریہ پیش کیا۔ ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا اور لاہور میں شاہی مسجد کے قریب دفن ہوئے۔

علامہ اقبالؒ نے اُردو، فارسی، دونوں زبانوں میں پُر اثر اور پُرسوز شاعری کی۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ مگر بعد میں زیادہ تر توجہ نظم نگاری کی جانب مبذول کر دی کیونکہ قوم تک اپنا پیغام پہنچانے کا یہ زیادہ مؤثر ذریعہ تھا۔ اقبال کا دائرہ فکر، مشاہدۂ کائنات اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے سچے عاشق تھے اور اس چاہت اور عقیدت کا اظہار جابجا ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔

اقبالؒ نے روایتی عشق و عاشقی کے موضوعات سے ہٹ کر اپنی شاعری میں زندگی، کائنات، خدا، ابلیس، عقل وخرد، تصوف، قومیت، مردمومن، سیاست ومملکت اور خودی و بے خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ جیسا عظیم شاعر و فلسفی آج تک پیدا نہ ہوسکا۔

''بانگِ درا، بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ان کی اُردو شاعری کی کتابیں ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں بھی کچھ اُردو نظمیں شامل ہیں جبکہ اس کا غالب حصہ فارسی میں ہے۔ فارسی کے دیگر شعری مجموعوں میں ''پیامِ مشرق، جاوید نامہ، زبورِ عجم، رموزِ بے خودی'' اور ''اسرارِ خودی'' شامل ہیں۔

# پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

(علامہ اقبالؔ)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ اقبال کی شاعری میں اتحاد و اتفاق کی اہمیت کو واضح کرنا۔
۲۔ طلبہ کو بتانا کہ قوم کا باہمی تعلق اور ارتباط ہی کامیابی کا ضامن ہے۔
۳۔ اقبال کے شعری اسلوب سے طلبہ کو روشناس کروانا۔

**مشکل الفاظ:** استوار ، برگ و بار ، ڈالی ، سحاب ، شاخ برید ہ ، طیور

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

ہے لازوال عہد خزاں اُس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل ' زر کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے

شاخ بُریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تُو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

# مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں۔

(الف) اقبال نے ڈالی اور شجر سے کیا مراد لیا ہے؟

(ب) جیبِ گل کس چیز سے خالی ہے؟

(ج) کس کے گلستان میں فصلِ خزاں کا دور ہے؟

(د) اُمیدِ بہار کے لئے کس بات کی ضرورت ہے؟

(ہ) عہدِ خزاں کس کے واسطے لازوال ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب اور مرکبات کے معنی بتائیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

فصلِ خزاں ۔ برگ وبار ۔ نغمہ زن ۔ شجرِ سایہ دار ۔ شاخِ بریدہ ۔ سبق اندوز ۔ اُمیدِ بہار ۔ قاعدۂ روزگار

۳۔ ''شاخ بریدہ سے سبق اندوز'' ہونے سے شاعر کیا مراد لیتا ہے؟

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے مترادف لکھیئے۔

گلستان ۔ خزاں ۔ بہار ۔ خلوت ۔ بریدہ ۔ ناآشنا

۵۔ آپ اِس نظم سے کیا سبق حاصل کرتے ہیں؟

۶۔ نظم کے پہلے دو اشعار کی تشریح کریں۔

۷۔ نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

## سرگرمی

۱۔ کمرۂ جماعت میں طلبہ کے مابین علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی پر تقریری مقابلہ کرائیں۔

۲۔ بچوں سے اقبالؒ کے اشعار کا مقابلہ کرائیں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری پر ایک جامع لیکچر دیں اور انہیں بتائیں کہ وہ تصور پاکستان کے خالق تھے۔

۲۔ طلبہ کو بتائیں کہ علامہ اقبالؒ ملت اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کے ایک عظیم مبلغ تھے۔

۳۔ طلبہ کو اس نظم کی غرض و غایت سے آگاہ کریں۔

۴۔ طلبہ کو علامہ اقبالؒ کی دیگر کتب دکھائی جائیں۔

# حفیظؔ جالندھری

پاکستان کے قومی ترانے کے خالق ابو الاثر حفیظؔ جالندھری ۱۹۰۰ء میں مشرقی پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔ جو جالندھر میں تجارت کرتے تھے۔ حفیظؔ نے سب سے پہلے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ ۱۹۰۷ء میں مشن ہائی سکول جالندھر کی ایک پرائمری شاخ میں داخل ہوگئے۔ بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول میں چلے گئے۔ جہاں ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ لیکن سالانہ امتحان میں فیل ہو گئے۔ پڑھائی سے طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ پھر سکول سے ایسے بھاگے کہ کبھی اُدھر کا دوبارہ رُخ نہ کیا۔ اُس زمانے میں شعروشاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تو جالندھری گرامی کے شاگرد ہوئے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ اس لئے جلد ہی عمدہ شعر کہنے لگے۔ گھر والوں کو ان کی شعروشاعری قطعاً پسند نہ تھی۔ چنانچہ حفیظ گھر سے بھاگ کر ریلوے میں ٹائم کیپر کے طور پر ملازم ہو گئے۔

۱۹۱۶ء میں جالندھر میں عطر کی دکان کھولی۔ مگر وہ دوستوں کی نذر ہوگئی۔ ۱۹۲۰ء میں رسالہ اعجاز نکالا۔ وہ کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا پھر سنگر کمپنی میں ملازم ہوکر اوکاڑہ چلے گئے۔ وہاں سے لاہور آ گئے تو رسالہ نونہال اور مخزن کے باری باری مدیر اعلیٰ رہے۔ ۱۹۲۲ء میں کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں حج کیا۔ پھر ۱۹۳۸ء میں سر عبدالقادر کے ہمراہ انگلستان چلے گئے۔ وہاں انیلا سے شادی کی۔ ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پبلسٹی ڈائریکٹر ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد افواج پاکستان میں موریل افسر بن گئے۔ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں انتقال ہوا۔

# نمودِ سحر

(حفیظؔ جالندھری)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ میں مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے کا شعور اُجاگر کرنا۔

۲۔ اُردو شاعری میں مناظر فطرت کی اہمیت بتانا۔

۳۔ اُردو شاعری میں حفیظؔ جالندھری کے مقام سے آگاہ کرنا۔

**مشکل الفاظ:** بساط ، ازل ، بیگانگی ، عارف ، سرُدھنا ، کامل

تمام ملک ہست پر بلند اور پست پر
قلم رو حیات پر
بساط کائنات پر
خموشیوں کا ہے چلن سکوت حکمران ہے
فسون مرگ سکہ زن حیات بے نشان ہے
وہ جوش زندگی نہیں
ہنسی نہیں خوشی نہیں
وجود بے وجود ہے جمود ہی جمود ہے
تمام ملک ہست پر
بلند اور پست پر
نسیم سرسرا گئی چمن میں گل کھلا گئی
کلی کو گدگدا گئی
تو پھول کو ہنسا گئی

طرب کے سیل نور سے جہاں کی نیند ڈھل گئی
حیات کے وفور سے خوشی کی آنکھ کھل گئی
گلوں کی نکہتیں اٹھیں
ہوا کے دوش پر چلیں
پڑی جو مہر کی نظر تو اُوس بن گئی گہر
نسیم سرسرا گئی
چمن میں گل کھلا گئی

## مشق

۱۔ شاعر نے نظم ''نمودِ سحر'' میں جو منظر کشی کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۲۔ نظم کے تیسرے بند میں شاعر کا جمود سے کیا مراد ہے؟

۳۔ درج ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کریں۔

سیل نور، حیات کے وفور، خوشی کی آنکھ، فسونِ مرگ، مہر کی نظر، جہاں کی نیند

۴۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

ہیت، پست، جمود، چمن، حیات، بے وفور

۵۔ نظم ''نمودِ سحر'' میں چند تشبیہات کا استعمال ہوا ہے۔ ان کی نشاندہی کر کے اُن کا تجزیہ کریں۔

۶۔ نظم ''نمودِ سحر'' کے پہلے بند کے دو مصرعوں میں ''ہیت'' اور ''پست'' جبکہ دوسرے دو مصرعوں میں ''حیات'' اور ''کائنات'' بطور قافیہ استعمال ہوئے ہیں۔ اب اس نظم کے باقی اشعار میں قافیہ کی نشاندہی کریں۔

۷۔ نظم ''نمودِ سحر'' کے مختلف اشعار میں ردیف کی نشاندہی کریں۔

۸۔ اس نظم کا ہر بند کتنے اشعار پر مشتمل ہے۔ اُردو شاعری کی اصطلاح میں ایسی نظم کو کیا کہتے ہیں؟

۹۔ کچھ ایسی نظمیں اپنی کاپی میں درج کریں جو مسدس کی ہیت میں لکھی گئی ہوں۔

''مسدس'' ایک ایسی صنفِ نظم ہے جس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاملِ نصاب نظم نمودِ سحر، میں بھی مسدس کی ہیت استعمال ہوئی ہے۔ اُردو شاعری میں بہت سے شعراء مثلاً میر انیس، مرزا دبیر اور بہت سے دوسرے مرثیہ گو شعراء نے اپنے مرثیوں کے لیے مسدس کی ہیت کا استعمال کیا ہے، مولانا الطاف حسین حالی کی معروف نظم مدوجزر اسلام کے لیے بھی مسدس کی ہیت استعمال ہوئی ہے۔ اس لئے اسے حرف عام میں ''مسدس حالی'' کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظموں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے لئے بھی مسدس ہی کی ہیت کو پسند کیا ہے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو شاعری میں منظر نگاری سے آگاہ کیا جائے۔

۲۔ حفیظؔ جالندھری کی شاعری میں منظر کشی کے لئے استعمال کی گئی خوبصورت تراکیب اور تشبیہات بتائی جائیں۔

۳۔ طلبہ کو صبح سویرے اُٹھنے اور مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے کا درس دیا جائے۔

# میر انیسؔ

میر ببر علی انیسؔ، میر خلیق کے بیٹے تھے۔۱۸۰۲ء میں شہر فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے۔ان کے مورثِ اعلیٰ میر امامی ہرات سے شاہجہان کے عہد میں آئے اور دہلی میں آباد ہوگئے۔شہنشاہ نے سہ ہزاری منصب عطا کیا۔مختلف حوادث کے باعث سلطنت مغلیہ کا انتشار شروع ہوا تو میر امامی کے پوتے میر غلام حسین ضاحک اپنے فرزند میر حسن کو، جن کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، ساتھ لے کر فیض آباد پہنچے۔جب مرکزِ حکومت لکھنؤ منتقل ہوا تو میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں شروع ہوگئی۔میر حسن کے تین بیٹے تھے۔ان میں سے ایک میر خلیق تھے۔میر انیس انھیں کے فرزند تھے۔میر انیسؔ بیالیس سال کے تھے تو مستقل طور پر لکھنؤ آگئے۔جہاں ۱۸۷۴ء میں وفات پائی۔

میر انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔میر ضاحک اپنے زمانے کے اچھے شاعر تھے، میر حسن مشہور مثنوی ''سحر البیان'' کے مصنف اور میر خلیق بلند پایہ مرثیہ نگار تھے۔اس صنف کو انھوں نے بڑی ترقی دی۔

میر انیسؔ کم عمری ہی میں مشقِ سخن کرنے لگے۔فارسی اور اُردو کے ہزاروں شعر انھیں یاد تھے۔ابتداء میں سلام کہا کرتے تھے اور اپنے والد سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

میر انیسؔ کی عظمت یہ ہے کہ وہ جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ انھیں خارجی جزئیات اور داخلی واردات دونوں کی تصویر کشی پر بے نظیر قدرت حاصل تھی۔مناظر قدرت اور رزم و بزم کا جو مرقع وہ پیش کرتے ہیں اُس کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہیں۔

# دنیا

(میر ببر علی انیسؔ)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو دنیا کی حقیقت سے آگاہ کرنا۔

۲۔ اُردو شاعری میں صنف نظم کی افادیت مختصراً بتانا۔

۳۔ اُردو شاعری میں میر انیسؔ کا مقام بتانا۔

**مشکل الفاظ:** املاک ، باج ، حلاوت ، صاحب نوبت ، عاریتی ، گُنج

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں
وہ گل ہے یہ گل، بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست، مروت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد، حلاوت نہیں جس میں

بے درد و الم شامِ غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

اس منزل فانی پہ، نہ دل اپنا لگاؤ
اُلفت نہ کرو، اُس سے جسے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے، یہاں گھر نہ بناؤ
پابندی دنیا سے بس، اب ہاتھ ہٹاؤ

چلتے ہوئے ہرگز کوئی کام آ نہ سکے گا
ہمراہ کچھ اسباب جہاں جا نہ سکے گا

اُمید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام
ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لبِ بام
یاں کام کرو ایسا کہ جو آئے وہاں کام
آجائے خدا جانیئے کب موت کا پیغام

اپنی نہ کوئی ملک نہ اَملاک سمجھنا
ہونا ہے سبھی خاک، یہ سب خاک سمجھنا

بھائی نہ تو کام آئے گا اُس وقت نہ فرزند
عرصہ نہیں، کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضا مند
ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند

پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہِ شاہ و گدا کنجِ لحد ہے

ہے زیرزمیں صاحب تخت و علم و تاج
جو صاحب نوبت تھے، نشاں اِن کے نہیں آج
جو شاہ کہ لیتے رہے شاہوں سے سدا باج
وہ بعد فنا آپ، کفن کے رہے محتاج

درویش و غنی اس کے ہمیشہ رہے شاکی
بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی؟

# مشق

۱۔ نظم دنیا کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۲۔ نظم دنیا کے تیسرے بند کی تشریح کریں۔

۳۔ نظم میں استعمال کیے گئے درج ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

زیرزمیں، شامِ غریباں، لبِ بام، کنجِ لحد، منزلِ فانی، اسبابِ جہاں، بوئے محبت

۴۔ نظم کے دوسرے بند میں شاعر کی منزل فانی سے کیا مراد ہے؟

۵۔ درج ذیل الفاظ کے مترادف لکھیں۔

راحت، حلاوت، اُلفت، خورشید، خاک، فرزند، پیوند، باج

۶۔ نظم دنیا اُردو شاعری کی کس ہیت میں لکھی گئی ہے۔ اُس ہیت کی پہچان کیا ہے؟

۷۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

فانی، گُل، مروت، بے درد، فنا، پابندی، جینا

۸۔ درج ذیل الفاظ میں واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیں۔

منزل، اسباب، موت، اَملاک

## سرگرمی

چند دیگر نظمیں بھی اپنی کاپی میں لکھیں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اُردو شاعری میں نظم گوئی کی اہمیت بتائی جائے۔

۲۔ میر انیس کی نظم گوئی کے بارے میں طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

۳۔ طلبہ کو دنیا کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔

# حصہ غزل

# میر تقی میرؔ

محمد تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔۱۷۲۴ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ اور نو سال کی عمر میں والد انتقال کر گئے۔ اس کے بعد منہ بولے چچا امان اللہ نے ان کی پرورش کی، مگر دو سال بعد وہ بھی فوت ہوگئے۔ اس کے بعد بڑے سوتیلے بھائی کے ہاں رہنے لگے، مگر ایک سال بعد انہوں نے گھر سے نکال دیا۔ اس کے بعد میر تقی میرؔ لکھنؤ آگئے اور مستقل طور پر وہاں رہنے لگے۔

میرؔ کے کلام میں جس قدر سوز و گداز اور درد و غم موجود ہے شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں موجود ہوگا۔ اس کی وجہ بچپن میں والدین اور منہ بولے چچا کی وفات، بھائیوں کا ناروا سلوک اور وہ محرومیاں، ناکامیاں اور مایوسیاں ہیں، جو ان کو زندگی میں پیش آئیں۔ اِسی لئے ان کی شاعری غم و آلام اور مصائب کا مجموعہ ہے۔

میرؔ کو اُردو غزل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے غزلیات کے علاوہ قصیدے مثنویاں اور مرثیے بھی لکھے، مگر ان کا اصل میدانِ کمال غزل ہے۔ ان کی غزل کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ جہاں آپ کے خیالات سادہ اور آسان ہیں، وہاں آپ کے الفاظ، تشبیہات، استعارے، محاورات اور تراکیب بے حد سادہ اور آسان ہیں۔

اُردو زبان میں ان کے چھ اور فارسی میں ایک دیوان موجود ہے۔۱۸۱۰ء میں انہوں نے لکھنؤ میں وفات پائی۔

# غزل

## مقاصدِ تدریس

۱۔ اُردو ادب میں میرؔ کے مقام سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو اُردو شاعری کی مشہور صنف غزل کے بارے میں بتانا۔
۳۔ غزل میں استعمال کی گئی مختلف تشبیہات اور تراکیب سمجھانا۔

**مشکل الفاظ:** تلک ، جرس ، دیار ، رائیگاں ، گریہ خونیں ، لیک

رہی نہ گفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اِس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ! کارواں میری

اِسی سے دُور رہا اصل مدعا جو تھا
گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائیگاں میری

تیرے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکرِ پریشان کہاں کہاں میری

رہا میں دور پسِ دیوارِ باغ مدت، لیک
گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری

ہوا ہوں گریۂ خونیں کا جب سے دامن گیر
نہ آستین ہوئی پاک دوستاں! میری

دیا دکھائی مجھے تو اِسی کا جلوہ میرؔ
پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

(میر تقی میرؔ)

# مشق

۱۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں شاعر نے ''آہ'' کو کس مفہوم میں استعمال کیا ہے؟

۲۔ درج ذیل تراکیب کو جملوں میں استعمال کریں۔

خیالِ مفلس، فکرِ پریشان، صورتِ جرس، عمرِ عزیز

۳۔ درج ذیل خالی جگہیں دیے گئے الفاظ سے پُر کریں۔

(i) غزل کے پہلے شعر کو............ کہتے ہیں۔ (قطع۔ مطلع)

(ii) شاعر اپنا تخلص غزل کے............ شعر میں استعمال کرتا ہے۔ (پہلے۔ آخری)

(iii) غزل کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر میں آنے والے ہم وزن الفاظ کو............ کہتے ہیں۔

(ردیف۔ قافیہ)

۴۔ اس غزل میں مطلع اور مقطع کی نشاندہی کریں۔

۵۔ اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں۔

گفتہ ۔ مدعا ۔ فراق ۔ جلوہ ۔ دیار

**غزل**:......شاعری کی وہ قسم جس میں عشق و محبت، ہجر و وصال اور شکایات زمانہ کا ذکر ہو۔ غزل عام طور پر پانچ، سات، نو یا گیارہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف اور اس کے بعد دوسرا مصرعہ مطلع کا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ زبان میں سادگی، روانی اور شرینی پائی جاتی ہے۔ لغت میں غزل کا مطلب عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں۔

**مطلع**:......غزل یا قصیدے کا وہ پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوں۔ لغت میں اس کے معنی نکلنے کی جگہ یا نکلنا کے ہیں۔ مثلاً:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

**مقطع:**......مقطع سے مراد کسی غزل یا قصیدے کا وہ آخری شعر جس میں شاعر عموماً اپنا تخلص استعمال کرتا ہے جس کی تکمیل کے ساتھ ہی غزل یا قصیدے کی تکمیل ہو جاتی ہے۔لغت میں اس کے معنی ختم کرنے یا کاٹنے کے ہیں: مثلاً

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

## سرگرمی

۱۔ میر تقی میرؔ کی کوئی غزل اپنی کاپی میں لکھیں۔
۲۔ کمرہ جماعت میں یہ غزل ترنم کے ساتھ کسی طالب علم سے پڑھوائیں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو غزل کی ہیئت کے بارے میں بتایا جائے۔
۲۔ اُردو غزل کی مختصر تاریخ بتائی جائے۔
۳۔ میر کے کلام کی خصوصیات بتائی جائیں۔
۴۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ اُردو غزل میں میر کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔

# خواجہ حیدر علی آتشؔ

خواجہ حیدر علی آتشؔ، خواجہ علی بخش کے ہاں ۱۷۶۴ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابھی آتشؔ بہت کم سن تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ کوئی سر پرست نہ تھا۔ مالی حالت بہت خراب تھی، تعلیم نہ ہوسکی۔ بعد میں البتہ کچھ عربی اور فارسی سیکھ لی۔ بُری صحبت میں بانکے ہوگئے۔

آتشؔ جوانی میں لکھنؤ آ گئے۔ یہاں اس وقت انشاؔء اور مصحفیؔ کی شاعری کا بازار گرم تھا۔ آتشؔ بھی مصحفیؔ کے شاگرد ہوگئے۔ مگر چند ہی روز میں اپنی محنت سے کمال حاصل کیا اور اُستاد کہلائے۔ سینکڑوں شاگردوں نے ان کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر درجہ اُستادی حاصل کیا۔

آتشؔ بہت آزاد منش، درویش صفت اور قلندرانہ طبیعت کے آدمی تھے۔ اسی لئے بادشاہوں کے دربار سے دور رہے اور کسی کی تعریف میں قصیدے بھی نہ کہے۔ آتشؔ کے کلام پر ان کی سادہ زندگی اور درویشانہ مزاج کا بہت اثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں صداقت اور واقفیت نمایاں ہے۔ ان کی زبان اس قدر صاف اور شُستہ ہے کہ آئینہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ کا لطف بھی پوری طرح موجود ہے۔ انہوں نے اُردو زبان کو مشکل الفاظ، غیر مانوس تراکیب، لاحقوں، سابقوں سے پاک کیا۔ ان کی جگہ سادہ، عام فہم الفاظ، مانوس تراکیب اور تشبیہات و استعارات استعمال کئے۔ ان کے کلام میں صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

# غزل

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو آتشؔ کی شعری خصوصیات سے روشناس کروانا۔

۳۔ غزل میں استعمال کی گئی مختلف تراکیب اور تشبیہات سے آگاہ کروانا۔

**مشکل الفاظ:** اسیر ، برگشتہ ، پیام بر ، شرح ، رفوگر ، طالع

یہ آرزو تھی، تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب، گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتشؔ
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

(آتشؔ)

# مشق

۱۔ غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر نے کس آرزو کا اظہار کیا ہے؟

۲۔ درج ذیل الفاظ قواعد کی رو سے کیا ہیں؟

آتش، زبان غیر، مہ و مہر، جستجو

۳۔ شرح آرزو میں ''شرح'' سابقہ ہے۔ اس سابقے کی مدد سے کم از کم پانچ الفاظ بنائیں۔

۴۔ شعر میں مقطع سے کیا مراد ہے اور اِس غزل کا کونسا شعر مقطع کہلائے گا؟

۵۔ اس غزل میں کونسے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

۶۔ اس غزل کے تیسرے شعر میں شاعر کی حبیب سے کیا مراد ہے؟

۷۔ اس غزل میں گفتگو' جستجو' آرزو' ہم آواز الفاظ ہیں۔ انہیں شعری اصطلاح میں کیا نام دیا جاتا ہے۔

۸۔ درج ذیل الفاظ کے معنی لکھیں۔

آرزو ۔ جستجو ۔ اسیر ۔ برگشتہ ۔ پیام

**تشبیہ:** تشبیہ کے لفظی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینا یا مثال دینا۔ جبکہ وہ خوبی جو دوسری چیز میں زیادہ پائی جاتی ہے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ مثلاً ''بچہ چاند کی طرح خوبصورت ہے''۔ اس جملے میں بچے کی خوبصورتی کو چاند سے تشبیہ دے کر اس کے حسن کو ظاہر کیا گیا ہے۔

**ارکان تشبیہ:**

(الف) مشبہ : وہ پہلی چیز جس کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مشبہ کہلاتی ہے۔ مثلاً بچہ

(ب) مشبہ بہ : وہ چیز جس کے ساتھ دوسری چیز کو تشبیہ دی جاتی ہے دوسری چیز مشبہ بہ کہلاتی ہے۔ مثلاً چاند

(ج) وجہ شبہ : مشبہ اور مشبہ بہ میں مشترکہ خوبی وجہ شبہ کہلاتی ہے۔ مثلاً خوبصورت۔

(د) حروف تشبیہ : وہ حروف جو تشبیہ دینے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً مانند، کی طرح، جیسا وغیرہ

(ہ) غرض تشبیہ : وہ مقصد اور غرض جس کیلئے ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً خوبصورتی۔

**استعارہ:** استعارہ کا لفظی معنی اُدھار لینے کے ہیں۔علم بیان کی رو سے جب کوئی لفظ اصل کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے اصل و مجازی معنوں کا تعلق تشبیہ کا ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔مثلاً جاؤ! اُس اُلو کو بلاؤ۔ اس جملے میں اُلو کے اصلی معنی مراد نہیں لئے گئے ہیں بلکہ اُلو ایک بے وقوف پرندہ ہے لہٰذا ایک احمق انسان کے لئے یہ لفظ ادھار لیا گیا ہے۔

استعارہ کے تین ارکان ہیں:

(الف) مستعارلہ (ب) مستعارمنہ (ج) وجہ جامع

## سرگرمی

۱۔ خواجہ حیدر علی آتش کی اس غزل سے اپنی پسند کے دو اشعار کاپی میں درج کریں۔
۲۔ کمرہ جماعت میں ترنم کے ساتھ اس غزل کو گایا جائے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کے سامنے اس غزل میں موجود تغزل اور موسیقیت کی وضاحت کی جائے۔
۲۔ غزل میں استعمال کی گئی تشبیہات بتائی جائیں۔
۳۔ دوسرے شعر میں شرح آرزو مرکب اضافی ہے۔مرکب اضافی کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی اور مثالیں طلبہ کو بتائیں۔

# مرزا غالبؔ

مرزا اسد اللہ نام اور غالبؔ تخلص تھا۔ شروع میں اسدؔ تخلص استعمال کرتے رہے۔ ۱۷۹۶ء میں مرزا عبداللہ بیگ کے ہاں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد چچا کی نگرانی میں پرورش ہوئی۔ چودہ برس کی عمر میں دہلی آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے۔

ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور فاضل اُستاد شیخ معظم سے حاصل کی۔ بعد میں ملا عبدالصمد سے فارسی زبان اور ادب میں مہارت حاصل کی۔ ان کا شمار اُردو کے درجہ اوّل کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ اُردو نثر میں بھی انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ فارسی میں بھی اشعار کہے۔

غالبؔ کو غزل کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ ایجاز واختصار، شوخی وظرافت اور طنز و مزاح ان کی غزلوں کی بنیادی خوبی ہے۔ ان کا ہر شعر لطیف معانی کا حامل ہوتا ہے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد رہے۔ ۱۸۶۹ء کو دہلی میں وفات پائی۔

# غزل

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو غالبؔ کے شاعرانہ مقام سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو غالبؔ کے شعری محاسن بتانا۔

۳۔ عہد غالبؔ میں اُردو کا ارتقاء بتانا۔

**مشکل الفاظ:** پنہاں ، جوئے خون ، روزن ، شام فراق ، فروزاں ، ماہ کنعاں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
بلبلیں سُن کر میرے نالے غزل خواں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرف درباں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

(مرزا غالبؔ)

## مشق

۱۔ غزل کے پہلے دو اشعار میں کس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

۲۔ غزل خواں میں ''خواں'' لاحقہ ہے۔ اس لاحقے سے پانچ الفاظ اور بنائیں۔

۳۔ مرزا غالب کے کوئی سے پانچ اشعار تحریر کریں۔

۴۔ چوتھے شعر میں شاعر کیا بتانا چاہتا ہے؟

۵۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

رنج ۔ روتا ۔ نمایاں ۔ ویراں ۔ بستیوں ۔ آساں

۶۔ اس غزل کی ردیف اور قافیہ کی نشاندہی کیجئے۔

۸۔ اعراب لگا کر تلفظ واضح کریں۔

لالہ وگل ۔ پنہاں ۔ بزم آرائیاں ۔ دبستان

**کنایہ:**...... کنایہ کے لغوی معنی ہے اشارے سے بات کہنا یا پوشیدہ انداز سے بات کرنا۔ جب لفظ کو اس کے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ مجازی معنی مراد ہونے کے باوجود حقیقی معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں تو اُسے کنایہ کہتے ہیں۔ مگر ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کنایہ میں بے شک حقیقی معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن کہنے یا لکھنے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مجازی معنی مراد لئے جائیں اور مجازی معنی ہی زیادہ صحیح اور موزوں ہوتے ہیں۔ مثلاً

(الف) وہ خاندانی آدمی ہے کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ اس جملے میں خاندانی آدمی سے مراد شریف آدمی ہے جو اچھے اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

(ب) اکبر کے بال سفید ہو گئے پر بات کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ بال سفید ہونے کے حقیقی معنی ہیں بالوں کا سفید ہونا مگر یہاں بڑھاپا مراد لیا گیا ہے۔

## سرگرمی

۱۔ غالب کی اس غزل کو زبانی یاد کیا جائے۔

۲۔ کمرہ جماعت میں غالب کی غزل تحت اللفظ پڑھی جائے۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو غالب کی شاعرانہ عظمت اور اُردو ادب میں اس کے مقام پر مختصر لیکچر دیا جائے۔

۲۔ غالب کی غزل میں استعمال کئے گئے مشکل محاورات اور تراکیب کو آسان زبان میں سمجھایا جائے۔

# بہادر شاہ ظفرؔ

سراج الدین نام، ظفرؔ تخلص، تیموری سلاطین ہند میں آخری بادشاہ تھے۔ ۱۷۷۵ء میں دہلی میں شاہی محل میں پیدا ہوئے۔ ظفر نے اُردو زبان کے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اپنے جملہ عیب و ہنر کے ساتھ ساتھ شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ دور تھا۔ قلعہ معلّٰی میں دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتیں۔ ان محفلوں میں نصیرؔ، ذوقؔ، ممنونؔ، مومنؔ، غالبؔ، تسکینؔ، شیفتہؔ جیسے شاعر شریک ہوتے تھے۔ جن کی شاعری نے زمینِ سخن کو آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ نوعمری ہی سے ظفرؔ کے لئے یہ محفلیں دلچسپیوں کا باعث بنی رہیں۔ ظفرؔ نے ان میں خوب خوب حصہ لیا۔ فطری لگاؤ کے باعث یہ مشغلہ آخری دم تک قائم رہا۔

ظفرؔ شاعری میں پہلے تو شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوئے، پھر بیقرارؔ، پھر ذوقؔ اور اس کے بعد غالبؔ کے شاگرد ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک غالبؔ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا اور اس کے ساتھ وہ بزمِ سخن درہم برہم ہوگئی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو زندگی کے آخری ایام میں رنگون میں قید کر دیا گیا اور وہیں بہ حالت اسیری ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

# غزل

(بہادر شاہ ظفرؔ)

## مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ میں شاعری کا ذوق اُبھارنا۔

۲۔ اُردو شاعری میں بہادر شاہ ظفرؔ کا مقام۔

۳۔ جنگِ آزادی کے دوران ہونے والی تباہی سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔

**مشکل الفاظ:** بگولا ، چٹیل ، سنگ ریزے ، سیم پر ، شغال ، یاقوت

جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے، کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے، چمن تھے اور شجر یاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اُڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیم پر یاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے، تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب، کبھی رُلتے گُہر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شر یاں تھے

جہاں اب خاک پر ہے نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشا دیدۂ اہلِ نظر یاں تھے

ظفرؔ! احوال عالم کا کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

# مشق

۱۔ شاعر نے غزل کے تیسرے شعر میں ماضی کے احوال عالم کا جو نقشہ کھینچا ہے اُسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۲۔ غزل کے چوتھے شعر کی تشریح کریں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفظ کی وضاحت کریں۔

ویرانہ، تودے، سنسان، چٹیل، یاقوت

۴۔ شاعر نے غزل میں درج ذیل تراکیب کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے ان کی وضاحت کریں۔

خاکِ صحرا، نقشِ پا، محوِ تماشا، شہرِ خاموشاں، آہوئے صحرا

۵۔ اس غزل میں استعمال کئے گئے مختلف قافیوں کی نشاندہی کریں۔

**مجازِ مرسل:۔** وہ لفظ ہے جو اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہو اور حقیقی و مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق نہ ہو مثلاً یہ کہنا کہ ''نہر بہہ رہی ہے'' حالانکہ نہر نہیں بہتی بلکہ پانی بہتا ہے۔ گویا نہر کہہ کر پانی مراد لیا گیا ہے۔ دونوں معنوں میں تعلق ضرور ہے یعنی پانی اور نہر میں ایک تعلق ہے۔

۶۔ مجازِ مرسل کی تعریف کریں۔

## سرگرمی

بہادر شاہ ظفر کی شاعری سے دو غزلوں کا انتخاب کر کے اپنی کاپی میں لکھیں۔

## اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو اُردو شاعری میں غزل کی اہمیت مختصراً بتائیں۔ ۲۔ بہادر شاہ ظفر کے اسلوب شاعری سے متعارف کروائیں۔
۳۔ طلبہ کو تراکیب، تشبیہات بتائیں۔

# فرہنگ

## اسلام میں گداگری کی مذمت

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| اپاہج | معذور، لولا، لنگڑا |
| ادنیٰ تامل | معمولی سوچ بچار |
| استطاعت | طاقت |
| اسراف | فضول خرچی |
| اقتصادیات | مالیات |
| اضطراری | پریشانی |
| انسداد | روکنا |
| الوالعزمی | پکا ارادہ |
| اندوختہ | جمع کیا ہوا |
| باز رکھنا | روکنا |
| بہ ایں ہمہ | ان سب کے باوجود |
| بیخ کنی | جڑ کاٹنا |
| ڈھٹائی | بے شرمی |
| ذریعہ معاش | روزی کا ذریعہ |
| ذم | برائی |
| سمِ قاتل | ہلاک کر دینے والا زہر |
| فحوائے کلام | بات کرنے کا طریقہ |
| فقہ | شریعت کا علم، علمِ دین |
| کفرانِ نعمت | نعمت کا انکار کرنا |
| گداگری | بھیک مانگنا |
| مستجاب الداعوت | جس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں |
| مستحقین | حقدار لوگ |

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| مدح | تعریف |
| مذمت | برائی |
| موجب | سبب |
| منطق | علم و دلیل (وہ علم جو منطقی دلائل سے بات کو ثابت کرے) |
| مرضِ متعدی | چھوت کی بیماری |
| مرتکب | کسی کام کا کرنے والا |
| مہتمم بالشان | انتظام کرنے والا |
| ہمت عالی | بلند ہمت |

## ہجرت نبوی ﷺ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| اشتہار | اعلان کی غرض سے چھپا ہوا کاغذ |
| بے تابی | بے قراری |
| تڑکے | منہ اندھیرے، صبح سویرے |
| جاں نثار | جان قربان کرنے والا |
| جبلِ نور | روشنی کا پہاڑ، ایک پہاڑ کا نام ہے |
| جھٹ پٹ | فوراً، بہت جلد |
| جھنکار | کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز |
| حرم | شرفاء کا زنان خانہ |
| دارالامان | وہ مقام جہاں امن ہو |
| دھنس گئے | گھس گئے |
| دستور | رواج |
| رؤسا | امیر لوگ |
| فدا | قربان |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| عقلیت | عقل سے کام لینا |
| عزم | ارادہ |
| عداوت | دشمنی |
| فرشِ گل | پھولوں کی زمین |
| کارساز | کام سنوارنے والا |
| گراں بہا | قیمتی |
| قضا | تقدیر، قسمت |
| محبوس | قید |
| موافق | مطابق |
| مؤرخانہ | تاریخ لکھنے والوں کی طرح |
| معیوب | بُرا |
| وجودِ اقدس | مراد حضور ﷺ |
| ہمہ تن گوش | پوری توجہ سے سننا |

## سیرِ زندگی

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| ادراک | فہم، سمجھ، عقل |
| ادنیٰ | معمولی |
| اضطراب | پریشانی |
| انبوہ | ہجوم |
| انواع و اقسام | طرح طرح کے |
| آفتوں | مصیبتوں |
| بادِ مراد | تمنا پوری کرنے والی ہوا |
| باہم | آپس میں |
| بے لاگ | بے غرض |
| بہترے | بہت سے |
| پختہ سال | بوڑھے |
| چابک دست | ہوشیار، ماہر |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| چھوا مُوا | جو چھونے سے مرجائے |
| چمن کے لہلہے | باغ کی رونق |
| حاجت | ضرورت |
| حواس ٹھکانے ہونا | ہوش و حواس درست ہونا |
| خلعتِ فاخرہ | انعامی لباس |
| داد بیداد | فریاد، دہائی |
| دق | پریشان، تنگ ہونا |
| در کنار | جدا، الگ |
| رفاقت | ساتھ دینا |
| سکت | طاقت، ہمت |
| ضرب رسیدہ | چوٹ کھایا ہوا |
| طراوت | تازگی |
| غارت | تباہ |
| کوتاہ اندیشی | لاپرواہ |
| کہر | دھند |
| گرداب | بھنور، پانی کے درمیان کا چکر جو انسان کو ڈبو دیتا ہے |
| ناخدا | ملاح، کشتی چلانے والا |
| عصا | لاٹھی |

## ایثار

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| آنکنا | تخمینہ لگانا، اندازہ کرنا |
| اِجت | عزت |
| ارادت مند | اعتقاد/خواہش رکھنے والا |
| اودھم مچانا | شور مچانا |
| ایثار | قربانی |
| باز آنا | توبہ کرنا، کسی بات کو چھوڑنا |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| بعینہٖ | بالکل ویسے ہی |
| بلائیں لینا | صدقے جانا، نثار ہونا |
| بنیا | آٹا دال بیچنے والا دکاندار |
| پنڈ چھڑاؤ | جان چھڑاؤ |
| پیادہ | پیدال سپاہی، پیدل چلنے والا |
| پیرومرشد | ہادی، رہنما |
| تلوا | پاؤں کا نچلا حصہ |
| تمازت | گرمی |
| تہی دست | خالی ہاتھ، مراد غریب |
| دست گیری | مدد |
| حلقۂ مریداں | مریدوں کا دائرہ |
| دفعتاً | اچانک |
| ڈگری جاری کرانا | عدالت سے حکم جاری کرانا |
| دھاڑیں مار مار کر رونا | زار وقطار رونا |
| زمین میں گڑ جانا | نہایت شرمندہ ہونا |
| شادیِ مرگ | ایسی موت جو بے حد خوشی کی وجہ سے واقع ہو |
| ضبط | برداشت |
| فارغ خطی | بے باقی کی رسید |
| گلوری | پان کا بیڑا |
| للہ | خدا کے نام پر |
| ناتا | تعلق |
| نانواں | قرضہ |
| نوج | خدا نہ کرے (کلمہ پناہ) |
| مندا | ڈھیلا، کمزور |
| وقعت | اہمیت |

## جموں میں پلیگ

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| اَدھ موئے | نیم مردہ |
| اُڑن کھٹولا | اُڑنے والا تخت |
| اغیار | غیر، دشمن |
| آزردہ | غمگین |
| بذلہ سنج | ہنس مکھ |
| بیلنس | برابری |
| بھاؤ | قیمت |
| پاکٹ منی | جیب خرچ |
| پلیگ | طاعون، خطرناک مرض جو چوہوں سے لگتا ہے |
| پسار کر | پھیلا کر |
| پھنکارا | پھونک/سانپ کا سانس لینا |
| پیپا | کنستر، ڈبہ |
| چنری | رنگ برنگا دوپٹہ |
| چھوت چھات | چھونے سے پھیلنے والی بیماری |
| خبرگیری | دیکھ بھال |
| دھتکارنا | جھڑکنا، غصہ کرنا |
| راج محل | راجہ کا محل |
| شانِ نزول | قرآنی آیات کے اُترنے کا موقع |
| ستو | بھنے ہوئے جَو کا آٹا |
| طشتری | چھوٹی تھالی |
| عضوِ معطل | ناکارہ |
| گلٹی | رسولی، غدود |
| گورکن | وہ شخص جس کا پیشہ قبر کھودنا ہو |
| متین وفطین | سنجیدہ مزاج، ذہین |
| نیاز | نذر، چڑھاوا |
| مسمار | گرانا، منہدم کرنا |
| وضعدار | اپنے طور طریقے پر رہنے والا |
| ہانک لگانا | آواز لگانا |

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| ہراس و وسواس | اندیشے میں رہنے والا |

## مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| احسان فراموش | احسان بھولنے والا |
| اسٹیج | تقریر |
| بادل نخواستہ | نہ چاہتے ہوئے بھی |
| بھڑ بھڑایا | منہ میں بھڑ بھڑ کرنا |
| بشاشت | تازگی |
| تخلیہ | تنہائی |
| حالتِ زار | بُری حالت |
| حرج | نقصان، ضرر |
| حیلے حوالوں | بہانوں سے |
| خلقت | فطرت، پیدائش |
| ریویو | تبصرہ |
| سرگرداں | حیران و پریشان |
| صدا | آواز |
| شوروشغب | شوروغل، ہنگامہ |
| شقی القلب | سنگدل |
| رونے بسورنے | رونے پیٹنے |
| غریب الوطن | پردیسی |
| ماتھا ٹھنکا | وقت سے پہلے خبردار ہونا |
| مذمت | برائی |
| مصافحہ | ہاتھ ملانا |
| محظوظ | خوش وخرم، مسرور |
| مسخ | خراب |
| قفس کاغذ میں بند کرنا | کاغذ پر تحریر کرنا |

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| نب ندارد | نب موجود نہیں |
| نچلا نہیں بیٹھنا | آرام سے نہ بیٹھنا |

## شہید

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| اُداس | غمگین |
| اُدھیڑ عمر | زیادہ عمر، بوڑھا |
| افسردہ | غمگین |
| بدستور | مسلسل، لگاتار |
| پلو | دامن، کنارا، آنچل |
| چھدری | بکھری ہوئی، جو گھنی نہ ہو |
| دراڑیں | درز |
| دستک | دروازہ، کھٹکھٹانا |
| ڈھنگ | طریقہ |
| رخسار | گال، عارض |
| حلقے | دائرہ |
| سعادت | نیازمندی |
| شفق | سورج کی صبح و شام طلوع اور غروب ہونے کی سرخی |
| کپکپاہٹ | لرزنا، گھبرانا |
| قوسِ قزح | وہ ساتھ رنگی کمان جو برسات میں آسمان پر دکھائی دیتی ہے |
| گھڑی | لمحہ |
| مدھم | دھیمی |
| لہو | خون |

## نام دیو مالی

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| اپج | نئی یا نرالی بات |
| بہارنا | جھاڑو دینا |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| باولی | وہ بڑا اور چوڑا کنواں جس میں پانی لینے کی خاطر اُترنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں تا کہ مسافر پانی پی سکیں |
| تھاوَلا | درخت کو پانی دینے کے لئے بنایا جانے والا گڑھا |
| تفویض ہوا | سپرد ہوا |
| ٹانگا | مضبوط |
| جھلو | غول، لکڑی |
| جُھلڑ | ہجوم، گروہ |
| داروغہ | نگراں |
| درجہ کمال تک | آخری درجے تک |
| ڈول | کنویں سے پانی نکالنے والی بالٹی |
| ڈھیر | انبار، ایک جگہ جمع ہونا |
| رسوئی کا چوکا | چولہے اور اس کے گرد کی جگہ |
| روش | کیاری |
| سنچائی | پودوں کو پانی دینا |
| سیوا | خدمت، دیکھ بھال |
| سیندھی شراب | کھجور کے رس سے بنائی گئی شراب |
| کندن | چمکدار |
| مسکن | ٹھکانہ |
| منکسرالمزاج | عاجزانہ طبیعت والا |
| محظوظ ہونا | لطف اندوز ہونا |
| ہمہ تن | پوری توجہ کے ساتھ، بہ غور |
| یورش | حملہ |

## مردہ بدست زندہ

| | |
| --- | --- |
| اُجرت | مزدوری |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| بھیڑ | رش، مجمع |
| بلیات | بلائیں |
| پاکھا | دیوار کا کونہ/ قبر کا کنارا |
| پٹاؤ | کڑی |
| تفویض | سپرد، حوالے |
| تنقیح وتنقید | نقص نکالنا، اعتراض کرنا |
| ٹٹو | چھوٹے قد کا گھوڑا |
| جائے عبرت | سبق حاصل کرنے کی جگہ |
| جائے وحشت | خوف کی جگہ |
| جیا | زندہ |
| جھاڑ پونچھ | صاف کر کے |
| چھاج | غلہ صاف کرنے کا آلہ |
| چھٹکارا | نجات، خلاصی |
| چال | رفتار |
| حیات وممات | زندگی اور موت |
| رسماً | رواج کے مطابق |
| رنج | دکھ |
| سقہ | پانی پلانے والا |
| سِل بٹا | مصالحہ پیسنے والا پتھر |
| شوفر | کار کا ڈرائیور |
| عود | ایک قسم کی لکڑی جو آگ میں جل کر خوشبو دیتی ہے |
| قبر کا تعویذ | قبر کی نشاندہی کیلئے صندوق کی طرح بنایا جانے والا نشان |
| قلانچیں | چھلانگیں |
| کمر کمر ہونا | انسانی کمر تک طویل ہونا |
| کریدنا | کھودنا، کھوجنا |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| کانگڑہ | ہندوستان کا ایک شہر جو زلزلے سے تباہ ہوا |
| کسمپرسی | بُری حالت |
| لب گور | قبر کے کنارے |
| متمکن | بیٹھے ہوئے |
| نوبت | ضرورت |
| وضع داری | شعار، طریقہ |

## خطوط غالب

## (ہرگوپال تفتہ کے نام)

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| اختلاط | میل ملاپ |
| انبساط | خوشی |
| امور | کاموں کی جانب |
| اہل حرفہ | کاریگر، ماہر |
| باہم | آپس میں |
| بلی ماروں | دہلی کے ایک محلے کا نام |
| بے چراغ | اُجڑے ہوئے |
| تحویل | قبضے |
| جنم | زمانہ |
| زنہار | ہرگز |
| خواہی | چاہے |
| غارت دلی | دلی کی تباہی |
| فتنہ | فساد |
| کوچہ | گلی |
| مسکن قدیم | پرانی رہائش گاہ |
| موسوم | لقب، نام رکھا گیا |
| ناگاہ | یکا یک، اچانک |
| مبالغہ | جھوٹ |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| ہرکارہ | ملازم، ڈاکیہ |
| مقدور | قدرت، طاقت |
| ہنود | ہندو کی جمع |

## (بنام یوسف مرزا)

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| امر | کام |
| ابنائے روزگار | روزگار کے ساتھی |
| بے سروپا | بے معنی، حیران و پریشان |
| پرسش | پوچھ گچھ |
| تجہیز و تکفین | کفن دفن |
| رزاق | رزق دینے والا یعنی اللہ تعالیٰ |
| کلیجہ کٹ گیا | دل کو سخت صدمہ پہنچنا |
| قید حیات | زندگی کی قید |
| قید فرنگ | انگریزوں کی قید |
| مقید | قید ہوا |
| واگزاشت | بحالی |

## (بنام علاؤ الدین علائی)

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| احتمال رفع ہو | شک دور ہو |
| از کار رفتہ | کام کے قابل نہ رہا |
| برت نہ سکے | استعمال نہ کر سکے |
| بہ اندازۂ بایست | اپنے انداز کے مطابق |
| درماندہ | مصیبت زدہ |
| داعی | دعویٰ دار |
| دوشنبہ | سوموار |
| زبان آور | زبان پر قدرت رکھنے والا آدمی |
| سعید یا سعیدہ | لفظی معنی خوش نصیب یہاں مراد، بیٹا یا بیٹی |
| شیراز | ایران کا شہر |

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| عیار طرار | چالاک، ہوشیار |
| فحوائے عبارت | تحریر کا انداز |
| نکبت | افلاس، بدحالی |
| نئے مہمان | نیا پیدا ہونے والا بچہ |
| مقہور | جس پر قہر نازل ہو |
| ماہِ صیام | رمضان کا مہینہ |
| یک فنہ | ایک فن کا ماہر |

## حصہ نظم

## حمد (مولانا الطاف حسین حالی)

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| ابد | آخر |
| ازل | پیدائش، ابتداء |
| آشنا | واقف، دوست |
| بیگانگی | اجنبیت |
| سر دُھننا | سر ہلانا |
| سکتہ | حیرت |
| عارف | عقل مند، واقفِ حال |
| عالم | دنیا |
| کامل | ماہر |
| ہر سُو | ہر طرف |

## نعت (امیر مینائی)

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| بشر | انسان |
| جلوہ نما | ظاہر ہونا |
| روضہء انور | حضورﷺ کا مقبرہ |
| سلطان | بادشاہ/ سب سے بڑا |
| شاد | خوش |
| شبِ معراج | وہ رات جب حضورﷺ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کیلئے آسمان پر تشریف لے گئے تھے |

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| عرشِ بریں | وہ آسمان جہاں اللہ تعالیٰ کا تخت ہے |
| مشتاق | خواہشمند |
| مَلک | فرشتے |

## (نظم) برسات کی بہاریں

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| ابر | بادل |
| جل تھل | وہ زمین جہاں بہت زیادہ پانی جمع ہو |
| جھمجھاہٹ | چمکنا، آب و تاب |
| کاہی | ہلکا سبز رنگ |
| گلزار | باغ |
| قطرات | بارش کے قطرے |
| ہر آن | ہر گھڑی |
| ہر جا | ہر جگہ |

## (نظم) پیوستہ رہ شجر سے

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| استوار | مضبوط، پائیدار |
| برگ و بار | درخت کے پتے اور پھل |
| ڈالی | شاخ، ٹہنی |
| سحاب | بادل |
| شاخِ بریدہ | کٹی ہوئی شاخ |
| طیور | طائر کی جمع، پرندہ |
| نغمہ زن | نغمہ گانے والا |
| عہد | زمانہ، وقت |

## (نظم) نمودِ سحر

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| بساط | قالین، فرش |
| حیات | زندگی |
| دوش | کندھے |
| سکوت | خاموشی |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| سیلِ نور | روشنی کا سیلاب |
| گدگدا | ہنسی کی کیفیت لانا |
| گُل | پھول |
| گُہر | موتی |
| نسیم | صبح کی ٹھنڈی ہوا |
| مہر | سورج |
| وجود | ہستی، جسم |
| وفور | کثرت، بہتات |

## (نظم) دنیا

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| آخری آرام گاہ | قبر |
| اسباب | سامان |
| املاک | جائیداد |
| اُلفت | محبت |
| باج | ٹیکس، خراج |
| بعدِ فنا | موت کے بعد |
| بے درد و الم | بغیر درد و غم کے |
| پیری | بڑھاپا |
| حلاوت | مٹھاس |
| خاک کا پیوند | مٹی کا ٹکڑا |
| خدا جانیئے | خدا جانے |
| راحت | آرام |
| سدا | ہمیشہ |
| صاحبِ نوبت | جن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا |
| عاریتی | عارضی، اُدھار |
| کُنج | کونہ |
| لحد | قبر |

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| مروت | حُسنِ سلوک |
| یکساں | ایک جیسی حالت |
| ہستی | زندگی |

## غزل (میر تقی میر)

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| پسِ دیوار | دیوار کے پیچھے |
| تلک | تک، آج کل یہ لفظ متروک ہے |
| جرس | گھنٹی |
| جلوہ | نظارہ، نمائش |
| دیار | وطن، شہر |
| رائیگاں | ضائع |
| فراق | جدائی |
| گریہ خونیں | خون کے آنسو رونا |
| لیک | لیکن، آج کل یہ لفظ متروک ہے |
| مدعا | مقصد |

## غزل (خواجہ حیدر علی آتش)

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| اسیر | قیدی |
| برگشتہ | ناراض |
| پیام بر | پیغام پہنچانے والا، قاصد |
| حبیب | محبوب |
| رفو | سینا |
| رفوگر | سینے والا |
| شرح | وضاحت |
| طالع | قسمت |

## غزل (مرزا غالب)

| الفاظ | معنی |
| --- | --- |
| پنہاں | چھپا ہوا |
| جوئے خون | خون کی ندی |

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| دبستاں | مکتب |
| روزن | سوراخ |
| روزن دیوار زنداں ہو گئیں | آنکھیں بے نور ہو گئیں |
| زنان مصر | مصر کی عورتیں |
| فروزاں | روشن |
| شام فراق | جدائی کی شام |
| طاق نسیاں ہونا | بھلا دینا |
| ماہ کنعاں | کنعاں کا چاند مراد حضرت یوسفؑ |

## غزل (بہادر شاہ ظفر)

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| آہو | ہرن |
| بشر | انسان |
| تودے | انبار، ڈھیر |
| چٹیل | جہاں کوئی سایہ دار درخت اور سبزہ نہ ہو |
| بگولا | مٹی کا گول چکر جو آندھی چلنے سے ہوا میں بن جاتا ہے |
| سنگ ریزے | پتھر کے ٹکڑے |
| سیم پر | چاندی جیسے پروں والی، مراد خوبصورت عورتیں |
| شغال | گیدڑ |
| گہر | موتی |
| نقش پا | پاؤں کے نشان |
| یاقوت | ایک قیمتی سرخ پتھر |

**تمت بالخیر!**

جملہ حقوق بحق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں
منظور کردہ صوبائی محکمہ تعلیم حکومت بلوچستان کوئٹہ، پاکستان No. SO (Academic)/ EDN:/ 2-6/ 2276 مورخہ 18 جنوری 2013 بمطابق قومی نصاب 2006ء اور نیشنل ٹیکسٹ بک اینڈ لرننگ میٹریل پالیسی 2007ء دفتر ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم اینڈ ایکسٹینشن سینٹر بلوچستان کوئٹہ بحوالہ مراسلہ نمبر C.B /9023 مورخہ 21 جنوری 2013 اس کتاب کو بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ نے ناشر سے پرنٹ لائسنس حاصل کر کے سرکاری سکولوں میں مفت تقسیم کے لیے بھی طبع کیا ہے۔ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ اور ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی امدادی کتاب یا گائیڈ وغیرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

# قومی ترانہ

پاک سَرزمین شاد باد کِشورِ حَسِین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان اَرضِ پاکِستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سَرزمین کا نِظام قُوّتِ اُخُوّتِ عوام
قوم، مُلک، سَلطنت پائِندہ تابِندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ سِتارہ و ہِلال رَہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ اِستقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

کوڈ نمبر U-IX/336(NP-2007)13 سیریل نمبر

| سال اشاعت | ایڈیشن | تعداد | قیمت |
|---|---|---|---|
| 2020 | اول | 34,000 | مفت تقسیم |